سید احمد شہید

کی

صحیح تصویر

وحید احمد مسعود

٧٨٦

سید احمد شہید

کی

صحیح تصویر

از

وحید احمد مسعود

ناشر

مکتبہ مسعود۔ مسجد گراؤنڈ۔ رام گڑھ۔ لاہور

قیمت ۲/۲۵ روپے

بار سوم۔

فہرس

نمبر صفحہ		نمبر شمار
۳	پیش گفتار	۱۔
۷	افتتاحِ سخن	۲۔
۱۲	فاتحہ	۳
۲۰	فاتحہ ثانی	۴
۲[illegible]	ابتدائی حالات	۵۔
۲۵	بیعت کا فسانہ	۶۔
۳۵	بیعت کے بعد	۷۔
۴۴	مذہبی انقلابات	۸۔
۷۵	تبلیغی دورے	۹۔
۹۶	حج	۱۰۔
۱۲۱	سیاسی ماحول	۱۱۔
۱۳۰	جہاد	۱۲۔
۱۹۵	تعلیم	۱۳۔
۲۳۲	حلیہ	۱۴۔
۲۳۶	کتابیات	۱۵۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء میں تیسری بار شائع ہوئی۔

پیش گفتار

جناب سیّد "احمد شہید" اور اُن کی "تحریکِ جہاد" کے بارے میں اُبتک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اُن کے عقیدت مندوں اور اُن کی "تحریکِ جہاد" کے رُوحِ رواں جناب شاہ محمد اسمٰعیل صاحب کے مقلدوں کے اذہان کی پیداوار ہے۔ اور ہر تذکرہ نگار نے اپنا اپنا راگ الاپا ہے۔ کسی نے بھی عقیدت کی عینک اُتار کر اصلیت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ سارا زورِ قلم سیّد صاحب کو مامور من اللہ، معصوم عن الخطا، مجددِ وقت، امام زمان اور تحریکِ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی نتیجہ لاحاصل اور ہر ذی شعور انسان ان ضخیم و جسیم تذکروں کو بہ نظرِ غائر پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس تحریک کے مایۂ ناز مورخوں سے بات نہیں بنی۔ اور ان سے وہ بات بھی چھپائی نہیں جا سکی۔ جس کو چھپانے کے لئے انہوں نے اس قدر مغز ماری کی ہے اور بیچارے محمد جعفر تھانیسری کو تحریف کا مرتکب "ثابت" کر کے اس کے کفن کو داغدار کیا ہے۔

ہاں یہ تذکرے عقیدت مندوں اور اندھے مقلدوں کے قلوب کو بہلا سکتے ہیں۔ گو ان کے دماغوں کو اپیل نہ کریں۔ مگر دل کا بہل جانا بھی تو بڑی بات ہے۔

ایسے تذکروں کو لکھ اور پڑھ کر اگر ایک خاص گروہ کے دل بہل جاتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک۔ مگر تاریخ کو مسخ کرنے اور زید کی پگڑی بکر کے سر رکھنے کی اجازت دے دینا۔ بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کی خاطر جناب مولانا وحید احمد مسعود مصنّف کتبِ کثیرہ نے ان موقع شناس

قلم کاروں کے خلاف، اپنے قلم حقائق رقم کو حرکت میں لاکر ان کی مصلحت آمیز تحقیقات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھدیا ہے اور جناب سید احمد شہیدؒ کی صحیح صحیح تصویر کھینچ کر عوام کے سامنے پیش کر دی ہے۔ محترم مولانا وحید احمد مسعود صاحب یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے علاوہ اہلِ علم کے شکریہ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ جزاہ اللہ تعالےٰ۔

پیشِ نظر کتاب "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" جناب مولانا مسعود صاحب نے ماہ نامہ "منادی" دہلی بابت ستمبر ۱۹۶۵ء میں خاص نمبر کی صورت میں شائع کروائی تھی اور مدیر "منادی" نے اپنے ادارتی نوٹ میں بڑی فراخدلی سے دعوت دی تھی کہ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو "منادی" کے صفحات اس کے لئے حاضر ہیں۔ مگر آج تک مدیر صاحب کی دعوت کو کسی نے شرف قبول نہیں بخشا۔ اور اب تک یہ کتاب لاجواب پڑی ہے۔ اس کا جواب لکھنا جن حضرات کے ذمے تھا، ظاہر ہے کہ ان سے ان کے مریدین نے وجہ خاموشی ضرور دریافت کی ہوگی۔ مگر منطقیانہ جواب دے کر ٹال دیا ہوگا لیکن جواب نہ دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ جواب نہ دے کر جواب الجواب کی زد سے بچا جائے اور بذریعہ خاموشی اس اُٹھ کھڑے ہوئے مسئلے کو ختم کر دیا جائے۔ ورنہ بنا بنایا کھیل خراب ہو جائیگا۔[۲] مگر یہ خیال خام ہے!

جملہ تذکرہ نویسوں کے بقول جناب سید صاحب متنوع خوبیوں کے مالک بزرگ تھے۔ لیکن اُن کی بنیادی اور سب سے اہم خوبی اُن کی بے پناہ روحانیت

---

[۱] یہ نوٹ افتتاح سخن کے زیر عنوان صـ۸ پر درج ہے۔

[۲] اب یہ کتاب تیسری بار شائع ہو رہی ہے۔ مگر تاحال کسی نے جواب نہیں دیا۔ (نعمانی)

اور کمال ولائیت ہے اور اُن ہی کمالاتِ عالیہ کی بدولت انہوں نے تسخیر خلائق کی تھی اور رُوحانیت کے زور سے لوگوں کو آمادۂ جہاد کیا تھا۔ اور سلاسلِ فقر میں ایک نئے سلسلے (طریقۂ محمدی) کا اضافہ کیا تھا۔۔۔ لہٰذا سیّد صاحب کی ذات کو پہچاننے کیلئے سب سے اوّل اُن کی اس مبینہ حیثیت کی حقیقت کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر کتاب میں سیّد صاحب کی اسی حیثیت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ماحصل بحث یہ ہے کہ جناب کی یہ حیثیت بھی مشتبہ ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آج محمدی سلسلہ معدوم ہے اور اس وقت اس "عظیم" سلسلے کا کوئی شیخ نظر نہیں آتا۔ اور اسی معدومیت کی بنا پر خود معتقدین سیّد صاحب میں سے دیوبندی گروپ کے لوگ دوسرے سلسلوں میں بیعت ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فیضانِ ولایتِ محمدی نہیں تھا بلکہ جناب شاہ صاحب کے علم و فضل کی کرشمہ سازیاں تھیں، غرض کہ جناب مصنف نے سیّد صاحب کی روحانی کیفیات کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

مسائل تصوّف عوام تو کجا بہت سے مولویوں کے فہم سے بھی بالا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بحث کو پڑھ کر وہی لوگ پورے طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں جنہوں نے تصوّف کی حقیقت کو سمجھا ہے لیکن عوام کی دلچسپی کے سوالات یہ ہیں:۔

— سیّد صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی جانب تھا یا سکھوں کی طرف؟

— سیّد صاحب نے تحریکِ جہاد کا آغاز انگریزوں کے اشارے پر کیا تھا یا حکم الٰہی سے؟

— سیّد صاحب نے انگریزی علاقے میں کھلے بندوں جہاد کی تیاری کی اور چندہ جمع کیا۔ مگر انگریز آڑے کیوں نہیں آئے؟

— سیّد صاحب اگر انگریز کے مخالف تھے تو انہیں انگریزی عملداری سے سرحد

میں مدد کیوں پہنچتی رہی ؟
— سید صاحب کو انگریزی عملداری سے باہر ہر مقام پر انگریزوں کا جاسوس کیوں سمجھا گیا ؟
— سید صاحب کی دعوتیں انگریزوں نے کیوں کیں ؟
— سید صاحب نے غیر ملکی انگریزوں کو نکالنے کیلئے سکھوں سے کوئی بات چیت کی تھی ؟
— سید صاحب نے سکھوں کے علاوہ سرحدی وقبائلی پٹھانوں کا جو خون بہایا کہاں تک جائز تھا ؟
— سید صاحب مجدد تھے تو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کر کے انہیں متحد ومتفق کیا یا بیسیوں اختلافی مسائل پیدا کر کے باہمی سر پھٹول میں مبتلا کر دیا ؟
— سید صاحب کے حکم سے بیوگان کے زبردستی نکاح کر دینے میں کونسی دانشمندی تھی ؟

ان سب سوالوں کے جواب اس کتاب میں موجود ہیں. مگر تفصیل کے بجائے اشاروں کنایوں سے دیئے گئے ہیں, جو حقیقت کے متلاشی کو مطمئن کرنے کیلئے کافی ہیں. ہٹ دھرمی, ضد اور تعصب بے جا کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے.

"سید احمد شہید کی صحیح تصویر" کی اشاعت یہاں بیحد ضروری تھی کیونکہ پاکستان ہی میں سب سے زیادہ اس تحریک کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے. کارکنان مکتبہ مسعود لاہور مستحق صد ستائش ومبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے تصویر کا صحیح رُخ عوام کے سامنے آ جائیگا۔ محققین کے لئے غور وفکر کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ اور یہاں کے عقیدت مند مصنفین جانبدارانہ تحقیقات کو چھوڑ کر حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۶۶ء

محمد سعید نعمانی

لاہور

افتتاحِ سخن

اس حقیقت سے کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کرسکتا کہ برصغیر کے صوفی بزرگ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے عقائد ان عقائد سے مختلف تھے جو آج ان کے مبینہ پیروکاروں کا طرۂ امتیاز ہیں اور جن کی وجہ سے چشتی صابری نسبت کے باوجود دیوبندی اسکول کو تصوف اور چشتیت کیلئے ایک تہمت سمجھا جانے لگا ہے۔ پیرو مرشد کے عقائد اور طریقۂ کار سے ایسا اختلاف حیرت انگیز بھی ہے اور تصوف کی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال بھی نہیں ملتی۔ تاہم عام لوگ اب تک اس اختلاف کی وجوہات سے ناواقف تھے۔ اور انہیں اس تاریخی پس منظر کی بھی خبر نہ تھی جس میں یہ اختلاف رونما ہوا۔ لیکن حال میں حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی قطبی کا ایک بصیرت افروز مقالہ حضرت حاجی صاحبؒ کے بارے میں ایسا شائع ہوا جس نے ہر چیز کی وضاحت کردی اور عقائد اور طریقۂ کار کا یہ اختلاف عام لوگوں کے لئے بھی کم از کم حیرت انگیز نہیں رہا۔

ناظرین کو مولانا فریدی کا یہ مقالہ یاد ہوگا کیونکہ اسے منادی میں بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کے بعد مشہور صحافی مولانا غلام رسول مہر کے جواب اور مولانا فریدی کے جواب الجواب کے طویل سلسلے کو بھی ناظرین نے فراموش نہ کیا ہوگا جس کا منادی میں باقاعدگی سے اندراج ہوتا رہا۔ اور جس سے عوام و خواص سب نے بے انتہا دلچسپی لی۔ اس دلچسپ بحث میں سب سے زیادہ گفتگو

حضرت سید احمد شہید کے بارے میں رہی۔ کیونکہ ان کے متعلق مولانا فریدی کے بعض ریمارک مولانا مہر کو شاق گزر رہے تھے۔ اور انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ مولانا فریدی کو اس کا جواب دیا تھا۔ منادی اس ساری بحث کو غیر جانبداری کے ساتھ چھاپ رہا۔ اور موافقت مخالفت میں کوئی رائے نہیں دی۔ اور نتائج اخذ کرنے کے لئے ناظرین کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی کا زیر نظر جامع مقالہ بھی (جس پر منادی کا یہ خاص نمبر مشتمل ہے) اسی بحث کا ایک حصہ ہے اور سابق کی طرح اب بھی منادی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے اور کوئی رائے دیئے بغیر اسے بے کم و کاست ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اب تک منادی میں مولانا مہر کے جوابات بھی چھپتے رہے تھے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا فریدی کا یہ مقالہ ہندوستان پاکستان کی موجودہ جنگ کے باعث مولانا مہر کی نظر سے جلدی نہ گزر سکے گا۔ تاہم مولانا مہر کے ہم خیال ہندوستان، اور ان غیر ممالک میں بھی کم نہیں ہیں۔ جہاں منادی جنگ کے دوران میں بھی بھیجا جا سکے گا۔ اسلئے ان میں سے اگر کوئی صاحب مولانا فریدی کی رائے سے اختلاف کرنا چاہیں تو ان کے لئے منادی کے صفحات حاضر رہیں گے۔ اور امن ہونے کے بعد مولانا مہر بھی اگر اس کا جواب لکھنا چاہیں گے تو اس کو بھی شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ رہیں۔ اور وہ کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں۔

یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے۔ اس سے کسی کو بُرا نہیں ماننا چاہیئے۔ سنجیدگی سے غور کیا گیا اور لوگ تعصب میں مبتلا نہ ہوئے تو انشاء اللہ اس سے افہام و تفہیم کی راہ نکلے گی۔ اور اختلافات کی خلیج پاٹنے میں مدد ملیگی کیونکہ اب تو حالت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم نامی کتابوں کا ذکر کرتے

ہی خانقاہی حلقے وہابیت کے خطرے سے چونک پڑتے ہیں اور انکے سامنے وہ روایت آجاتی ہے کہ شاہ اسمٰعیل جب سکھوں سے لڑنے جانے لگے تو دلی میں انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بابت کہا کہ :-

"سکھوں کی مہم سے فارغ ہوجاؤں تو اس بت خانے کو بھی ڈھاؤں گا۔"[1]

اسی طرح سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل وغیرہ سے ذہنی طور پر وابستہ طبقہ اور دیوبندی سکول خانقاہ اور درگاہ کا نام آتے ہی بدعت اور شرک کے ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتا ہے اور ذرا نہیں سوچتا کہ جس چیز کو وہ بدعت اور شرک سمجھ رہا ہے، وہ درحقیقت بدعت اور شرک ہے بھی یا نہیں اور اس کے ذہن میں اس واہمے نے کس طرح اور کیوں جگہ پائی ہے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ میں اجمیر شریف گیا تو ڈر رہا تھا کہ ابھی کوئی خادم آئے گا۔ اور زبردستی میری گردن پکڑ کر مزار کے سامنے سجدہ کرنے کیلئے مجبور کرے گا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو گردن پکڑنا تو الگ رہا کسی نے زبان سے یا اشارے کنائے تک میں مجھ سے سجدے یا آستاں بوسی کے لئے نہیں کہا اور سب لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور میں نے اپنے عقیدے کے مطابق حاضری دی :-

ناظرین منادی حضرت مولانا وحید احمد صاحب سے بخوبی واقف ہیں ان کو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی اولاد امجاد میں سے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور وہ مشرقی و مغربی قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیمات

---

[1] شاہ صاحب نے یہ بات اسلئے کہی ہوگی کہ انہیں یہ یقین تھا کہ انگریز انکی اس خواہش کو پورا کرادیں گے کیونکہ انکے تعلقات انگریزوں سے ایسے ہی تھے (محمد سعید نعمانی)

سے بہرہ ور ہیں۔ ایک عرصے تک انگلستان میں رہے ہے۔ تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا۔ حکومت یو۔پی کے پارلیمنٹری سیکرٹری کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ گوشہ نشینی، ترک و تجرید اور مجاہدات سے بھی آشنا رہے غرض یہ کہ وہ ہمہ صفت موصوف بزرگ ہیں۔ اور ایک دنیا ان کی دیکھی ہوئی ہے ان کے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا انداز تقلید سے آزاد ہے۔ انکے نزدیک تاریخ ایک پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تاریخ کو بس گواہ اور شاہد سمجھتے ہیں۔ اور اس کے طے شدہ اور ریڈی میڈ فیصلے نہیں مانگتے اور جو تاریخ اس قسم کے فیصلے دیتی ہے۔ اس کو ایجاد بندہ سمجھتے ہیں۔ وہ دروغ کو راوی کی گردن پر رکھ کر بے فکر نہیں ہو جاتے۔ بلکہ راوی کی گردن کو اس کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ اور آخری فیصلے اور حکم کا حق راوی کے بجائے اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور فیصلہ دیتے وقت کسی قسم کی رو رعایت پسند نہیں کرتے ان کا فیصلہ تذبذب سے پاک اور دو ٹوک ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اس سے سنگدلی ٹپکتی ہے۔ اور قائم شدہ عقیدوں اور تصورات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ عدل و انصاف میں فریدی صاحب رحم دلی کو جائز نہیں سمجھتے شاید اسلئے کہ یہاں کرپشن کا روپ دھار لیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں مولانا فریدی نے حضرت سید احمد شہید کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے۔ لیکن یہ تصویر کسی قدر دھندلی ہے۔ اس کے نقوش واضح نہیں ہیں۔ مولانا کا زیادہ وقت اُن تصویروں کو ضائع کرنے میں صرف ہوا ہے جو دوسروں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اصلیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور لوگوں کے تصورات کی پیداوار ہیں۔ ان تصویروں سے محروم ہونے پر لوگ کڑھیں گے کیونکہ یہ تصویریں بہت خوبصورت

اور بڑی دلکش تھیں۔ ان کے بدلے میں فریدی صاحب کی بنائی ہوئی جو تصویر لوگوں کو ملے گی وہ بُری نہ سہی لیکن اتنی حسین بھی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت پسند آدمی کے لئے اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا ہو سکتا ہے؟

اگر مولانا فریدی کی رائے مان لی جائے اور ان کے فیصلے کو صحیح اور قطعی اور آخری فیصلہ سمجھا جائے تو ہندوستان کی تمام "نیم وہابی" تحریکوں کا سرچشمہ ایک ایسی تحریک قرار پائے گی جس کو ایک غیر مُسلم اور غیر ملکی اقتدار یعنی انگریزوں کی شہ پر شروع کیا گیا تھا اور جس کو بعد کے آنے والے بے سمجھے بُوجھے باپ دادا کا قابلِ احترام درنہ سمجھتے رہے اور جس کی خاطر اپنے اصل راستے سے بھٹک جانے میں بھی انہوں نے کوئی قباحت محسوس نہ کی۔

اُمید ہے مولانا فریدی کے اس بصیرت افروز مقالے سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھایا جائے گا۔

حسن ثانی نظامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاتحہ

حمد بے حد ہے خدائے پاک کی! مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ہے ایسا شکر جس کی نہایت نہیں۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مہربانی ہے۔ ایسی مہربانی جس سے حقائق الٰہی حاصل ہوتے ہیں اور بزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی توجہ ہے جو ہر وقت ہدایت کرتی رہتی ہے کہ یہ رسالہ تکمیل کو پہنچ سکا۔ میں اپنے احباب و معاونین کا شکریہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اسمائے گرامی ظاہر کرنے کی ممانعت ہے حکمت یہی ہے کہ ید بیضا بغل میں رہے۔ مگر میری دعائے خیر ان تک پہنچ جائے گی۔ میں ان حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں جو میری اس کاوش کو منجملہ مخالفت و اعتراض سمجھیں۔ ان سے میری یہی التجا ہے کہ اپنے گمان کو دور کریں۔ اور قابل اعتراض امور کو میری کوتاہی سمجھ کر اصلاح فرما دیں۔ ان کا یہ کرم میرے اور ان کے بلکہ سب کے حق میں مفید ہوگا ورنہ میری تسلی کیلئے یہی کافی ہے کہ یہ تنقید عقیدت مندی کی تاریکیوں کو کسی قدر چھانٹ دے گی یا انہیں اور زیادہ تنگ نظر بنا دے گی۔

میرا مدعا بیت بازی نہیں ہے۔ بلکہ اتحاد بین المسلمین ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ رسالہ حضرت سید احمد شہید کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان تذکروں کی جو ان کے متعلق اس وقت تک لکھے گئے ہیں، ایک تنقید ہے۔ جو نقائص مجھے نظر آئے۔ وہی پیش کر رہا ہوں۔ حاشا اس سے اعتراض مقصود نہیں۔ مدعا اصلی

تصحیح ہے۔ یہ خامیاں میرے خیال میں یوں وجود میں آئیں کہ سوانح نویسوں نے کیرکٹر کو بنانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ عقیدت مندی نے ذم کے پہلو کو سمجھنے نہیں دیا۔ کبھی آسمان کی کہہ دی اور کبھی زمین کی لکھ دی یہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سید صاحب کی صحیح تصویر نہ کھنچ سکی اور ان کی عظیم شخصیت معمہ بنکر رہ گئی۔ ان کے سوانح یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ہیچ میں ہر دو ہیچ۔ نہ انہیں ملا سمجھا جا سکتا ہے نہ طبیب بتایا جا سکتا ہے۔ نہ ولی کہا جا سکتا ہے اور نہ عالم۔ ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان کی نوعیت کا تعین کیا جائے کہ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اسی معیار سے ان پر روشنی ڈالی جائے۔

وہ مرشد تھے، شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی ان کی پالکی کو پکڑ کر ادباً پیدل چلا کرتے تھے لیکن بعد میں یہی ادب گستاخیوں میں منتقل ہوتا چلا گیا ہے۔ ان کے احکامات کی تعمیل نہیں کی گئی۔ گویا سید صاحب کی روحانیت شاہ اسمٰعیل کے ظاہری علم کی تعظیم کرنے لگی تھی۔ وہ ولی تھے؛ لیکن ان کی کرامتیں معجزات سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔ باوجود ان کی بے نفسی و عجز کے غصہ و غضب کے آثار بھی دکھائے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ میں بحالت خواب سید الکونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے جچی تلی گفتگو کی ہے۔ اس میں ادب کا شائبہ نہیں۔ واقعہ پشاور کے بعد وقتِ وداع سب کو بیعت سے آزاد کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ:

"مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جیسی کسی کو قے سے ہو"۔ معصومیت اور ولایت کی مکمل تردید ہے۔ وہ بہادر اور سپاہی تھے؛ مگر سرحد میں وہ اپنی بہادری اور سپہ گری کے جوہر نہ دکھا سکے۔ وہ عالم تھے؛ انہیں وہبی علم حاصل تھا۔ مگر وقت ضرورت ان کی علمیت پردۂ اخفا میں روپوش ہو گئی۔ اخلاق کریمانہ کی دھوم ہے مگر جب داغ لگا ہوا گوشت سامنے آیا تو دال پر گذر کی اور پکانے والے کو سخت

الفاظ سے یاد کیا۔ غرض ان کے جملہ اوصاف میں تناقض دکھایا گیا ہے اور اس طرح انہیں معجون مرکب بنا دیا ہے،

(۱) اُردو میں سب سے پہلا تذکرہ "سوانح احمدی" یعنی "تاریخ عجیبہ" ہے جو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے۔ وہ کئی بیش بہا کتابوں کے مصنف ہیں انکی قابلیت میں کلام کی گنجائش نہیں،

ہنٹر نے بتایا ہے کہ جعفر کی سوانح عمری جو تھانیسر کی منڈی میں عرضی نویس تھا بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اپنی قابلیت سے بڑھتے بڑھتے اپنے قصبہ کا نمبردار ہو گیا۔ ایک دن اس نے اتفاقیہ ایک وہابی مبلغ کا وعظ سنا۔ اور اس نے مسلمانوں کی بدعتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ اور ہمہ تن مذہبی اصلاح میں مصروف ہو گیا۔ اس کی کتاب "جعفر کے نصائح" قابل دید ہے جو ۱۸۶۳ء میں لکھی تھی۔ اس میں خود لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بارہ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد میری والدہ نے مجھے تعلیم دلوائی۔ ۱۸۵۶ء میں عرضی نویسوں کے زمرہ میں داخل ہوا۔ حتیٰ کہ تمام وکیل مجھ سے قانونی مشورے لینے لگے۔ جعفر کی آمدنی خاصی تھی مگر عدالتوں سے حاصل کئے ہوئے روپیہ کو وہ اپنے صرف میں نہیں لاتا تھا۔ اور اس کو حرام سمجھتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد غدر، پٹنہ کے مولوی یحییٰ علی کا شریک کار ہو گیا۔ ان دونوں نے سنہ کی قیدیوں میں سازش کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے نمایاں جگہ حاصل کی۔ یہ دونوں مخلص و با اصول انسان تھے۔ انہیں سزا ہوئی سر رابرٹ ایڈورڈ نے مقدمہ انبالہ کے فیصلہ میں جعفر کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور سزا کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں۔

اور اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی ــــ جب کالے پانی سے رہائی پاکر ۱۸۸۳ء میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے کتابیں لکھیں ۔"

جعفر کی تحقیق مستند ہے۔ انہوں نے خود اعلان کیا ہے کہ قریب چار سو صفحوں کے مختلف مؤلفوں کے لکھے ہوئے سوانح میرے سامنے ہیں مگر میں نے ان پھولوں سے عطر کھینچ لیا ہے تاکہ ہر کہ ومہ اس کا پھویا لے کر معطر ہو جائے۔ باایں اختصار اہم مطالب کو فوت نہیں ہونے دیا ہے۔ گو کہ قیمتی کراماتی واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔"

سید صاحب کے حالات کے متعلق جتنا مواد ممکن تھا۔ وہ انہوں نے فراہم کر لیا تھا۔ جیسا کہ خود انہوں نے اظہار کیا ہے۔ ان کی تحقیق قابل داد ہے۔ ان کے تدین کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی ناکامی کے اسباب جو ان کی سمجھ میں آئے وہ صاف صاف لکھ دیئے۔ برخلاف ان کے دوسرے تذکرہ نویس سخن سازی وتاویل کے ذریعے ناکامی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں انہوں نے تقویۃ الایمان پڑھی اور اس جماعت پر ایمان لائے تھے۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جماعت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کالے پانی کی سزا ان کو دی گئی تھی اور رہائی پاکر ہندوستان آئے تھے۔

(۲) حیاتِ طیبہ میں مرزا حیرت دہلوی نے تمام سہرے شاہ اسمٰعیل کے سر باندھے ہیں۔ اور اس کے ضمیمہ میں ادب وعقیدت مندی کے ساتھ سید صاحب کا ذکر خیر کیا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک کے اجراء میں مولوی عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل کو سید صاحب پر تقدم حاصل تھا۔ اس تذکرہ کی روایات میں بعض جگہ اختلاف ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنا کہ ان کا ذریعہ معلومات غلط تھا۔ صحیح نہیں (واقعہ نہ ان کی رائے اور معیار کو غلط سمجھا جا سکتا ہے)۔

مرزا حیرت خود لکھتا ہے کہ ـــ "میں نے جو کچھ لکھا ہے ...... تو سمجھ لے گا کہ بزرگ سیّد کی اصلی سوانح عمری یہاں بیان ہوئی ہے اندڈھکوسلے بازی، دوسرے سوانح نویسوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ چاہے اس سے دلچسپی لے اور چاہے تسکین کرے ...... (نواب ٹونک) وزیرالدولہ کو جب اعتقاد تھا تو پنجاب سے واپس آنے والے ہمراہیوں کو، وقعت پیدا کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی سوا اس کے کہ ان کے غائبانہ پیر کی مدح سرائی کی جائے، اور ایسی ایسی کرامتیں اس بزرگ سیّد کے سر چپکی جائیں جن سے ان کی ذات مبرا تھی" (حیات طیبہ صـ ۵۲۹)

(۳) سیرت سیّد احمد شہید۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ وہ سیّد صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ سیّد صاحب کے متعلق جو خانگی روایات تھیں وہ بھی درج کی گئی ہیں۔ اسی لئے دوسرے تذکرہ نویسوں پر انہیں فوقیت حاصل ہے۔ نہائت خوبی و احتیاط سے انہوں نے حالات لکھے ہیں۔ مگر کیریکٹر کو نہ نباہ سکے اور تناسب جاتا رہا۔

(۴) مولانا غلام رسول مہر صاحب کی "سیّد احمد شہید" معرکتہ الآرا ضخیم تالیف ہے۔ بڑی جانکاہی سے معلومات فراہم کی ہیں اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مفصل حالات لکھے ہیں، ان کا ذخیرہ معلومات لاجواب ہے اور ہر معاملہ و واقعہ کو اتنی وضاحت و قابلیت سے لکھ دیا ہے۔ کہ پڑھنے والوں کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرنی پڑتی۔ صحیح ربط و مدارج کا ان کے یہاں بھی پتہ نہیں چلتا جس کی وجہ سے صحیح تصویر نہ اُتاری جا سکی۔ ان چاروں کتابوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے اور موازنہ کیا جائے تو دماغ چرخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل داستان فرضی اور مصنوعی ہے اور طلسم ہوشربا کا نمونہ ہے۔ ہر مؤلف نیا ترانہ الاپ رہا ہے۔ ان حضرات نے محض اپنے نظریہ کے

مطابق روایات کا انتخاب کیا ہے۔ اور بقیہ روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ضرورت تھی کہ دقتِ نظر سے جملہ روایات پر تنقید کر کے تجزیہ کیا جاتا تو رسالہ بہر صورت تذکرہ قابلِ وقعت ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی۔ وہ اپنی کیفیات میں محدود کر کے مخفی رکھنا چاہتے تھے اپنی ذات کی انہیں پرواہ نہیں تھی۔ مگر حاشیہ نشین اور ارادت مند اُن کی ہستی کو بڑی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے اور عجیب انداز میں بیان کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ مضمون صادق آیا کہ ——— " دیگر قسلم ند کف دشمن است؟

شاہ اسمٰعیل کو ترجمانی کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ سید صاحب کے جذبوں کو انہوں نے ہی اپنی قابلیت سے اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحی کی حیات میں شاہ اسمٰعیل احتیاط کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ مگر مولوی عبدالحی کی عدم موجودگی میں اور ان کی وفات کے بعد وہ بالکل بدل گئے تھے یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے حالات مولوی عبدالحی کی وفات سے پہلے اور وفات کے بعد دو لخت نظر آتے ہیں۔ بحر اور قافیہ کا لحاظ نہیں رہا اور وزن بھی بگڑ گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اسی حقیقت کو اپنی سیاسی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ مولوی عبدالحی کی وفات کے بعد مرکز دہلی کی اہمیت جاتی رہی۔ دہلی سے یعنی شاہ محمد اسحٰق سے تعلقات منقطع کر لئے گئے اور نیا مرکز سرحد میں بنا لیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کی علمیت و مصلحت اجازت دیتی تھی کہ سید صاحب کی تصویر جس رنگ میں چاہیں کھینچیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے جب شاہ اسمٰعیلؒ کے بجائے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہ اسمٰعیل کو تحتِ شعور میں مایوسی نہ ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں شاہ اسمٰعیل کو اپنی وجاہت قائم رکھنے کے لئے نیا راستہ بنانا تھا اور وہی بنا بھی لیا۔ ابتداء میں مولوی عبدالحی

کی سرپرستی حاصل کر کے شاہ محمد اسحٰق سے الگ رہے۔ اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے جہاد کا منصوبہ گانٹھا۔ سید صاحب کے مرید ہونے کے بعد تعلقات ترک نہیں کئے بلکہ ایک قسم کا بُعد اختیار کیا۔ آخر کار سید صاحب کے پروں پر اُڑنے لگے۔ باوجود سید صاحب سے بیعت کر لینے کے ان کی فضیلت علمی اور مصلحت بینی نے سید صاحب کا کلی طور پر اتباع نہیں کرنے دیا۔ اس کی تصدیق ہی کہنا چاہیئے کہ جہاد کو جاتے ہوئے مولوی عبدالحی کو اجمیر سے دہلی بھیج دیا گیا۔ اور تمام تر ذمہ دار شاہ صاحب ہی بنا دیئے گئے۔ لیکن ان سب کے باوجود شاہ اسمٰعیل کے کارناموں میں سید صاحب کی ملوکیت جھانکتی ہوئی نظر آجاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ سید صاحب کے حالات علیحدہ کر کے شاہ صاحب کے رنگ میں دکھائے جائیں۔ سید صاحب صُلح کل تھے۔ اُن کے حامی تھے۔ اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دے کر توحید کی لا انتہا و بے پناہ وسعت کو چمکانا چاہتے تھے۔ مگر اتنی مدت مدید کے بعد تاریکیوں میں سے ان کے درخشاں اصول کو علیحدہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر ممکن ہے۔ جانب پرستی نے ان کے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان تذکروں سے خرافات دُور کر کے سید صاحب کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر ان کے حالات جمع کئے جائیں۔ تاکہ سید صاحب کی عظمت نمایاں ہو سکے۔ خس و خاشاک چھانٹ کر ان کے اوصاف حمیدہ کی نشاندہی کرنا اس رسالہ کے ذریعہ میرا کام ہے۔ کوئی اہل ہمت جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ سید صاحب کے گوہر گرانمایہ کو صاف صاف منظر عام پر پیش کر دے۔ تو بعید نہیں۔

ان صاحبان نے فروعی مسائل میں اپنی جدتوں سے جو انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی تردید علماء اہل سنت نے کی ہے۔ اور جواب میں حدیث و قرآن سے استدلال کر کے بہترین مواد جمع کر دیا ہے۔ لیکن نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی

ہے کہ علمائے اہلسنت نے ان حضرات کی تعلیم کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ یہ تعلیم جو سید صاحب نے منسوب کی ہے شریعت و طریقت دونوں سے مرکب ہے و اشعار تصوف طریقت کے اصولوں سے سطحی طور پر واقف تھے۔ لہٰذا علم معقول کے ذریعہ طریقت کی جو لت انہوں نے بیان کی ہے وہ بے تکی اور ناقص ہے۔ علمائے اہل سنت خود ان کی اپنی طریقت کی منزل میں نہیں پہنچے۔ اسی لئے طریقت والے گزر پر انہوں نے ذہن نوٹ نہیں کی۔ اگر وہ ہر دو علم حاصل رکھتے تو یقین ہے کہ خلیج پٹ جاتی اور آنکھ میں اہل فہم کی ... اصلاح کی خاطر یہ کام آج بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ فریقین تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں۔ اور ایک دوسرے کی دلیلوں پر انصاف سے غور کریں۔ اصل مقصود کو چھوڑ کر فروعات کی سانس وحدت مسلمین کو خطرے میں ڈالنا مذہب اسلام کی توہین ہے اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ تقاضائے وقت ہر طرح سے شیر و شکر ہو جانے کی ہدایت کرتا ہے اب بھی اگر آیات الٰہی پر توجہ نہیں کی گئی اور سبق حاصل نہیں کیا گیا تو نتیجہ معلوم۔ ڈوبنے والی کشتی ڈوبنے سے بچ نہیں سکتی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

تنبیہ

وحید احمد مسعود قطبی صابری شیخوپور بدایوں۔

یکم جولائی ۱۹۶۵ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

فاتحہ ثانی

ہم سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی

"سید احمد شہید کی صحیح تصویر" پر یہ نظر ثانی رواروی میں بغیر یکسوئی سکون و قرار کے کی گئی ہے۔ یہ مضمون رسالہ منادی دہلی بابت ستمبر ۶۵ء میں چھپا تھا۔ پھر جولائی ۶۶ء میں مکتبہ مسعود لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اور اس کی جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔ مجھے مسرت ہے اور ممنون ہوں کہ یہ جسارت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ اب اتنی جلد نظر ثانی کے لئے اصرار اسلئے ہے کہ بعض اشارے تفصیل چاہتے ہیں۔ اور اسلئے بھی کہ جہاد کے متعلق میری رائے واضح طور پر نہیں سمجھی گئی۔ اور میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ ابھی تک سید صاحب کے معتقدین نے کوئی جواب نہیں لکھا ہے۔

میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مجھے بیت بازی منظور نہیں ہے اور نہ ہی کسی تنگ نظری سے کام لینا چاہتا ہوں اور واضح کر دیا تھا کہ اگر میری کسی رائے سے اختلاف ہو اور وہ صحیح بھی ہو تو مجھے تسلیم کرنے میں کبھی تکلف نہ ہوگا۔ اب جواب نہ لکھے جانے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ــــ جواب جاہلاں باشد خموشی ــــ اور دوسری یہ کہ ان کے ہی بیانات میں تضاد و اختلاف ظاہر ہونے پر تدبر و تفکر سے مطالعہ کر رہے ہیں اور غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ میں نے غلطی کہاں پر کی ہے اور ان کے بیانات میں کس قدر مبالغہ، بے سروپائی اور تصنع ہے۔ پہلی وجہ کا میرے پاس سکوت کے سوا اور کوئی جواب نہیں اور دوسری

وجہ سے مجھے خوشی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقیقت تک رسائی ہو سکے گی۔ الحمد للہ شانہ کہ ہمیں بعضہ برآور پر دہلیل جس سے اصل نصب العین یعنی اتحاد بین المسلمین کے متعلق کوئی صورت نکلے گی۔ انشا اللہ!

گذشتہ مرتبہ اپنے خیال میں سید صاحب کے جہاد کے متعلق میں نے واضح بحث کی تھی مگر شاید میری بے بضاعتی کی وجہ سے میرا مفہوم سمجھا نہ جا سکا۔ اس مرتبہ مزید تشریح کر رہا ہوں۔ اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں معذور ہوں،

جو اشارے محتاج تفصیل ہیں۔ ان کی بھی وضاحت اس مرتبہ حتی المقدور کر دی ہے۔ ترمیم و تنسیخ کے علاوہ تین باب مزید لکھے ہیں۔ جن سے عقائد اور ماحول کے متعلق کچھ واقفیت حاصل ہو گی۔ والسلام مع الاکرام

بندۂ محبت وحید احمد مسعود۔ شیخوپور ضلع بدایوں۔ یوپی

نومبر ۶۲ء

۷۸۶

(۱)

ابتدائی حالات

رائے بریلی کا مشہور و معروف قطبی خاندانِ سادات کسی تعارف کا محتاج نہیں شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں شاہ علم اللہؒ آدم بنوری کے خلفا میں سے تھے۔ ان کی اولاد میں متعدد بزرگ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے سید نعمانؒ کے بھائی سید محمد عرفانؒ زہد و تقویٰ میں مشہور تھے ان ہی کے صاحبزادے جناب سید احمد تھے، یہ یکم ماہ محرم یا ماہ صفر ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) کو بعہد شاہ عالم ثانی (۱۸۰۶-۱۷۵۹ء) میں پیدا ہوئے تھے اور اسی سال لارڈ کارنوالس نے ہندوستان کی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ ان صاحبزادے میں عام بچوں کی سی باتیں نہیں تھیں خصوصیت یہ تھی کہ من موجی تھے۔ اپنی کہتے تھے اور جو کہتے تھے مختصر کہتے تھے۔ اور خود ہی سمجھتے تھے۔ زبان صاف نہیں تھی، وہ آخر تک صاف نہیں ہوئی مسکینی، غریبی، کم سخنی اور آہستہ سے بات کرنا آپ کی خصوصیات میں تھے۔ (حیات طیبہ) ان کے بڑے بھتیجے سید محمد علی ان سے عمر میں بڑے تھے انہوں نے اپنی کتاب مخزن احمدی میں لکھا ہے کہ سید صاحب کی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی، تحصیل علم سے رغبت نہ تھی۔ آثار   ظاہر ہونے لگے۔ حیات طیبہ کا بیان ہے کہ غیر معمولی سکوت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے غبی مشہور تھے۔ بچپن میں ہی نہیں بلکہ جوانی میں بھی پڑھنے لکھنے کی طرف رجوع نہیں تھی۔ قرآن پاک ناظرہ پڑھا تھا، اس کی چند سورتیں یاد ہو گئی تھیں۔ کریما کا پہلا مصرع خاصہ

دعا سیر ہے۔ مگر کچھ پڑھ کر نہیں دیا۔ تین برس کی تعلیمی کوشش کے بعد ان کے والد سید محمد عرفان صاحب نے فرمایا:۔

”انہیں خدا پر چھوڑ دو۔ وہ ان کے حق میں جو بہتر سمجھے گا، کرے گا۔“

بہرحال ان صاحبزادے کے حرکات و معاملات سے بے رخی ظاہر ہوتی تھی۔ انہیں ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔ جب انہوں نے خود اپنے [illegible] تو تب نہیں کی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

تعلیم سے نجات پا کر ان کے دو شغل تھے۔ [illegible] جہاں [illegible] گھومتے پھرنا اور ہمسایوں کے [illegible] ساتھ [illegible] اور خدمتگزاری نے انہیں بستی بھر کا محبوب بنا دیا تھا۔ [illegible] لے [illegible] تھے۔ [illegible] کی [illegible] سے کام لینا جیسا [illegible] ان کی [illegible] بھی لکھانے کا شوق تھا۔ جب [illegible] سال کے [illegible] عمر سے [illegible] کچھ عرصہ [illegible] کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ اپنے سات عدد [illegible] لئے، چلتے چلتے جا کے غدر کے شہر لکھنؤ پہنچ گئے۔ [illegible] وہاں کی معاشرت سے نا واقف تھے۔ وہ [illegible] کو نہیں [illegible] اور کچھ [illegible] وہاں [illegible] کو [illegible] سے دیکھا جاتا تھا [illegible] تو کھو گئے۔ وہاں کی تسلیم و آداب کو گوارا کر لیا [illegible] شریف [illegible] ان کی مدارات ہوئی۔ مگر ان کی دل [illegible] ہوئی۔ [illegible] کچھ ماہ مہینے گزار کر ایک دن بے علم و اطلاع ساتھیوں کو چھوڑ کر لکھنؤ سے [illegible] سمایا چل پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ اس تنہائی و بے کسی کے سفر میں لوگوں نے ان کی کرامات کا بھی مشاہدہ کیا۔ اور ہر ایک نے اپنے یہاں ٹھیرانے کی کوشش کی مگر یہ رکنے والے نہیں تھے۔ گردش روزگار نے ۱۲۲۲ھ میں چلتے چلتے انہیں دہلی پہنچا دیا۔ دہلی پہنچ کر انہیں شاہ عبد العزیزؒ کا خیال آیا کیونکہ گھر والوں سے ان کا ذکر سنا تھا لہذا پوچھتے پوچھتے شاہ صاحب کے یہاں پہنچ گئے شاہ صاحب ان کے خاندان سے واقف تھے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور شاہ عبد القادرؒ کے پاس اکبری مسجد میں بھیج دیا۔ مقالات سرسید جلد ۱۶ صفحہ ۲۴۵ پر مذکور ہے کہ سید صاحب پہلے شاہ عبد القادرؒ کے پاس پہنچے تھے۔ اور انہوں نے تعلیم کے لئے سنبھال لیا تھا مگر تعلیم پر توجہ کرنے سے زیادہ وہ ان درویشوں کی خدمت کرتے تھے جو مسجد میں مقیم تھے بعد میں شاہ عبد العزیزؒ نے اُن پر توجہ فرمائی۔ اس زمانہ میں شاہ اسمٰعیل بھی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے۔ لہذا کچھ دن سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل سے بھی تعلیم پائی تھی۔ قیام دہلی میں جب شاہ صاحب کے خاندان میں آداب عرض کرنے کا رواج دیکھا تو اعتراض کر دیا کہ السلام علیکم کہنا چاہیئے۔ یہاں جتنی بھی کتابیں پڑھی ہوں مگر حسب معمول نتیجہ صفر تھا۔ کہتے ہیں کہ کافیہ تک پڑھا تھا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ مشکوٰۃ شریف کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ مگر بے دلی و بے رغبتی کا حال معلوم کر کے شاہ عبد العزیزؒ نے انہیں اپنے پاس بلایا اور جائزہ لے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ اس دنیا کے آدمی نہیں ہیں۔ اس کے بعد انہیں روحانی تعلیم دینے کے لئے مرید کیا۔ اور مجاہدات کروانے کیلئے حجرے میں بٹھا دیا۔ قیام دہلی کی مدت ڈیڑھ سال بتائی جاتی ہے۔ مجاہدات سے انہیں فائدہ ہوا۔ اس خوش آئند تبدیلی کا باعث شاہ صاحب ہوئے۔ لہذا ان کے فیضِ صحبت سے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔

اتنی سی بات تھی اسے افسانہ کر دیا

(۲)

بیعت کا فسانہ

بیعت معمول کے مطابق لی گئی تھی. مگر اس کو اہمیت دیکر عجائبات کا ایک معمہ بنا دیا ہے. اقرار ہے کہ طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت لی تھی. مگر تشریح غرابت کے ساتھ کی گئی ہے. لکھا گیا ہے کہ بیعت لیتے وقت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ

" اگرچہ اس صاحب باطن کو رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج نہیں ہے. مگر اہل ظاہر کی رفع حجت کے لئے بیعت لئے لیتا ہوں "

شاہ صاحب کے طریقہ میں رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج لازمی ہے اگر شاہ صاحب سمجھتے کہ وہ کامل ہیں تو بیعت لیکر فعل عبث نہ کرتے. مرید اقرار کیا کرتا ہے کہ مرشد کی فرمانبرداری کیا کروں گا. بیعت کے معنی ہیں :-

" دل بدست دگرے دادن و حیران بودن " بیعت ہو جانے کے بعد مرید کی کوئی مرضی نہیں رہتی اور چون و چرا کا اسے کوئی حق نہیں رہتا. بیعت صفائی باطن کے لئے لی جاتی ہے. بیعت کے وقت ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷) میں سید صاحب کی عمر اکیس سال کی تھی. ظاہر کیا گیا ہے کہ پہلے دن لطیفۂ قلب کی تعلیم فرمائی گئی. دوسرے دن پانچوں لطیفے کھل گئے. تیسرے دن سلطان الاذکار کی منزل طے ہوئی چوتھے جلسہ میں نفی و اثبات حاصل ہو گیا. پانچویں دن کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے غالباً چھٹی رہی ہوگی. چھٹے جلسہ میں طریق یاد داشت پر عبور ہو گیا. معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے محض اصطلاحیں جانتے تھے اور طریقت سے واقف نہ تھے ورنہ ایسی بے تکی روایت نہ کرتے. حضرت شیخ مجدد سرہندی قدس سرہٗ نے باوجود علم و فضل

رکھنے کے یہ منازل ڈھائی مہینہ میں طے کئے تھے۔ اس داستان کو سن کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحب کا ظرف نہایت درجہ عالی تھا جو توجہ کو برداشت کر کے کچھ دن میں یہ مرحلے طے کر گئے۔ ورنہ اتنی تیزی میں حوا کس ہی نہیں جان جاتی رہتی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ شاہ صاحب نے شغل برزخ یا تصور شیخ کی ہدایت کی تو سید صاحب نے منت و سماجت سے عرض کیا کہ مجھے اس شغل سے معاف کر دیا جائے یہ تو سراسر بت پرستی ہے۔ شاہ صاحب نے سمجھایا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ "بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" پر عمل کرنا چاہئیے۔ مگر سید صاحب کے جواب سے ثابت ہے کہ یہ [illegible] جیسے گناہ کبیرہ کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ تصور شیخ جیسا شرک نہیں کر سکتا۔

عقل حیران ہے کہ سید صاحب نے کیسی جہالت کی بات کہی۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے۔ شاہ صاحب ان کی عقل و فراست کو سمجھ گئے اور جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ انہیں اپنی بغل میں لے کر ان کے رخسار و پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا

"اے فرزند ارجمند حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ولایت اولیا اور ولایت انبیا تم کو مرحمت کی۔"

بغلگیری اور بوسہ تبنی تو صحیح ہے مگر ولایتوں کے عطیہ کا ایک مبتدی سے جو نابلد بھی ہو، ذکر کرنا ممکن نہ تھا۔ بر حیرتم کہ عیب تیرے کمان زدہ است۔ یہ صاحب باطن نابلد ہونے کا اقرار خود کر رہا ہے کہ براہ کرم بتا دیجئے کہ یہ ولایت اولیاء اور ولایت انبیا کس چڑیا کا نام ہے۔ یا تو تصور شیخ سے وہ انکار یا یہ بے علمی کہ ولایتوں کے معنی و فرق کو دریافت کرنا پڑا۔ لکھنے والے شاید خود بیعت سے نابلد ہیں ورنہ ایسی بے سر و پا نہ اڑاتے۔ یا پھر ان امور سے یہ ظاہر کرنا ہے۔

کہ سید صاحب نے مرشد کی اصلاح کرنا چاہی اور امتحان لیا۔ یہ عجب بازی مدرسوں میں ہوتی ہے۔ خانقاہ میں نہیں ہوا کرتی۔ شاہ صاحب نے قال کا حال سے جواب دیا یعنی بغل میں لے کر رخسار و پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنی روحانی قوت کا اثر ڈالا۔ یہ بوسہ تھی ہدایت، خود راز ہے یہ ہے جس کو ناواقف راہِ طریقت نہیں سمجھ سکتے۔ صاحب "سید احمد شہید" نے صفحہ ۷۷ کے نوٹ میں طریقت سے ناواقفیت کا اقرار کرتے ہوئے اپنا قیاس ظاہر کیا ہے کہ،

"شاہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ دوا سید صاحب کے مزاج کے سازگار نہیں آ سکتی کیونکہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور مزکی تھی کہ تصور شیخ کو قبول نہ کر سکی لہذا اسے تجویز نہ کیا۔ اور تصور شیخ کی ضرورت نہ سمجھی۔"

جس علم سے واقفیت نہ ہونے کا اقرار ہو، اس کے متعلق قیاس آرائی عقلمندی سے بعید ہے۔ ورنہ کہہ دیا جائے گا کہ ھذا بہتان عظیم۔ یہ طریقہ سب کو پاک مزکی بنانے کے لئے ہی تمام پاپڑ بیلا کرتا ہے۔ اگر جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کے قیاس کو تسلیم کر لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے جسوں سے شاہ ولی اللہ کی تعلیم سے حضرت مجدد سرہندی کے طریقے سے اور چاروں سلاسل کے معمولات سے انحراف و اختلاف کر دیا کیونکہ یہ سب تصور شیخ کے عامل ہیں۔ محمد عاشق پھلتی، احمد رضا خاں بریلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور خود صاحب صراط مستقیم نے اس کو جائز لکھا ہے۔ اسی اصول پر مولوی مرتضیٰ دیوبندی لکھا کہ سید صاحب نے خود تسکین دی ہے اور میاں محمد حسین کا اقرار ہے کہ۔

"جس وقت میں نے سید صاحب سے بیعت کی مجھ پر میرا وجود منکشف ہو گیا اور پھر دل میں نظر ڈالتا تھا تو سید صاحب ہی سید صاحب نظر آتے تھے۔" (سیرت سید احمد شہید ص ۲۷۵)

مولوی رشید احمد گنگوہی" امداد نمبر ۳ کے صفحہ ۲۹۰ پر رقمطراز ہیں کہ:-

" تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اُس سے پوچھے کوئی کام نہیں کیا۔"

اس آخری فقرہ کے معنی یہ ہوئے کہ تصور بولتا تھا اور جواب دیتا تھا تصور کو بُت اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ تصور بول سکتا ہے اور بُت نہیں بول سکتا بہر حال مفہوم کچھ ہی ہو مگر بغل گیری اور بوسہ بختی کے بعد بتایا گیا ہے کہ سید صاحب کو ولایت اولیاؑ اور ولایت انبیاؑ کا مژدہ سنایا گیا۔ معلوم نہیں یہ مبارکباد ہے یا پیشین گوئی ہے۔ تصور استحکام محبت کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کو شرک فی العلم سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے۔ اس سے جملہ وساوس دفع ہوجاتے ہیں۔ اس کے کامل ہوجانے پر عالم ملکوت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ حدیث احسان تصور کے دو طریقے بتاتی ہے۔ یا یہ سمجھو کہ خدا تعالےٰ دیکھ رہا ہے۔ یا یہ خیال جاؤ کہ تم اللہ جلشانہٗ کو دیکھ رہے ہو۔ اور پھر یہ تو واقعہ ہے کہ تصور شیخ کے متعلق تواتر اجماع امت کی دلیل ہے حضرت مجدد سرہندی۔ شاہ ولی اللہ۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی۔ یہ سب تصور کے قائل ہیں مولانا روم فرماتے ہیں:-

چوں خلیل آمد خیال یار من
صورتش بُت۔ معنیٔ او بُت شکن

اب بھی اگر دھاندلی۔ ضد اور ہٹ کی جاتی ہے تو اعلانیہ اقرار ہے:-

آرے آرے میکنم با شیخ و واعظ کار نیست

یہ انکار تصور ہی اس نئے مسلک کی بنیاد ہے جس کی تردید خود سید صاحب کے طرز عمل سے ہوجاتی ہے۔ پھر اس سنگ بنیاد کو دلائل کے فرق سے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کی توجیہہ وتشریح تقویۃ الایمان اور صراط

مستقیم میں وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ جس کا لُب لباب یہ ہے کہ مجاہدات کے ذریعہ ولایت اولیا حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب سالک مزید تکمیل کر کے مخلوق کی تبلیغ کرنے کو متعین کیا جاتا ہے تو اس خدمت تبلیغ کی اہلیت کو ولایت انبیاؑ کہا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ بجملہ ولایت سے افضل ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد ارشاد کیا گیا ہے کہ ۔۔۔۔۔ "اس میں ایک نکتہ باریک ہے جس کو اس زمانہ کے لوگ نہیں سمجھتے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے تحصیل کر کے جب ولایت انبیاؑ میں پکے ہو جاتے تھے تو ولایت اولیا کو شروع کرتے تھے۔ دونوں ولایتوں میں تخالف نہیں ہے اور دونوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ ہر طرح صحیح ہے۔ مگر قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ولایت انبیاؑ جو بنیاد اور اصل ہے اور ولایت اولیا مثل نقش و نگار کے ہے جب ولایت انبیاء کی عمارت تیار ہو جاتی ہے تو اس پر ولایت اولیا کے گل بوٹے لگائے جاتے ہیں۔ مگر اب جاہل فقرا اور نادان سالکوں نے ثانی کو اول مقرر کر کے ولایت انبیاؑ کو ہاتھ سے کھو دیا ہے۔ اور شروع ہی سے ولایت اولیا میں پڑ کر برباد ہو گئے ہیں۔ حالانکہ "اٰمَنَ ثُمَّ جَاهَدَ" کی حدیث مشہور ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر مجاہدہ کرو۔"

اس حدیث نے یہ ثبوت دیا کہ ایمان لانا ولایت انبیاؑ ہے۔ اور مجاہدہ کرنا ولایت اولیا ہے ۔۔۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کیلئے ۔۔۔ اس نکتۂ باریک میں جدت فراست اور عجوبیت علم و فضل کے ذریعہ اس درجہ بھروی ہے کہ اس کو جہالت و خرابی دماغ اور شیطنت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ ابتدا سے جملہ بزرگان دین ولایت انبیاؑ کو اول اور ولایت اولیا کو مؤخر مانتے چلے آئے ہیں ۔۔۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد ۔۔۔ علمیت کا یہ نمونہ ہے

کہ حدیث کے معنی پلٹ دیئے۔ اور یہ کہہ کر دُنیا بھر کی آنکھوں میں خاک جھونک دی۔ گویا مؤخر کو مقدم بنا کر اسمٰعیلیہ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا لی۔ اب کس طرف کو سجدہ کیا جائے۔ یہ جدت تقویۃ الایمان میں سید صاحب کی بیعت سے پہلے لکھی گئی تھی۔ پھر بیعت کے بعد صراط مستقیم میں بھی دوہرا دی۔ سید صاحب کو اس سے وحدت کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صراط مستقیم کے مسلک کے خلاف شاہ عبدالعزیز صاحب کی زبان سے تائید کرائی گئی ہے۔ اندھیر ہے۔ یہ شعبدہ ان کی نئی کرامت ہے۔

بیشک احادیث و قرآن کی تعلیم سے ایمان پختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجاہدے کئے جاتے ہیں۔ قدیم اور عام طریقہ یہی ہے کہ مجاہدات کو ولایت عامہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ولایت خاصہ کی دو قسمیں ہیں۔ ولایت اولیا اور ولایت انبیاؑ۔ ولایت کو ہمیشہ سے تقدم حاصل ہے۔ بیشک شریعت طریقت حقیقت و معرفت کا مقصد محبت الٰہی ہے۔ اور محبت کے بھی کئی اقسام ہیں۔ حُبِ عقلی اپنے فائدہ کے مدنظر کڑوی دوا کو گوارا کر لیتی ہے۔ حُبِ ایمانی کا نام شریعت ہے۔ اور یہ بالکل اختیاری ہے۔ چونکہ یہ اختیاری ہے۔ اسی لئے اس پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ یہی حُبِ ایمانی ترقی کر کے حُبِ عشقی بن جاتی ہے۔ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ کی آیت کریمہ اسی حُبِ عشقی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ حُبِ ایمانی گویا حُبِ عشقی کا مقدمہ ہے۔ حُبِ عشقی میں نہ اختیار ہے نہ ارادہ۔ لہٰذا اب یوں سمجھنا چاہئے کہ حُبِ ایمانی کے دو درجے ہیں یعنی ولایت اولیا اور ولایت انبیاؑ۔ ولایت اولیا میں اللہ تعالیٰ کی ذات بحت کی تجلی صفات کے پردے میں ہوتی ہے۔ جہادِ نفس اس کے لئے لازمی ہے اور تصورِ شیخ کی اسی منزل میں ضرورت ہوتی ہے اور اسی کو جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ولایت انبیا میں تجلی کا ظہور بلاواسطہ ہوا کرتا ہے۔ اس مرتبہ کا

جہاد، جہاد اصغر ہے۔ یہی منزل فنا فی اللہ کی ہے۔ صاحب ولایت انبیا کا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالٰے خود اس کا ہاتھ، کان اور زبان بن جاتا ہے۔ اور گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ اندریں صورت کون ہے جو قدم اول پر ہی بلا واسطہ تجلی کی برداشت نہ کر سکے۔ وہ اگر کر سکتا ہے تو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں یا ہوش و حواس کھو کر مجذوب مطلق بن کر رہ جاتا ہے۔ اب بندہ نواز مشورہ ابلیس جو کچھ بھی تاویل کریں ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ مگر یہ بات ان ... خلاف فطرت۔ بلندی سے دیکھنا انبیا کے لئے مختص ہے۔ . . .

. . . . پستی سے بلندی کی طرف عروج کرنا ولی کی خصوصیت ہے۔ صوفیہ کی نظریں پستی سے بلندی کی طرف جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ترقی کے مدارج یہ ہیں (۱) سالک ناقص (۲) سالک مجذوب (۳) مجذوب (۴) مجذوب سالک اور پھر (۵) سالک کامل۔ یہاں تک کے بعد سالک، مخلوق سے حق کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی کو ولایت اولیاء سیر الی اللہ اور مرتبہ جمع اولیاء کا مقام کہا جاتا ہے۔ جب کمال حاصل کر کے سالک حق کی طرف سے مخلوق کو تربیت دینے کے لئے متعین ہوتا ہے تو اسے ولایت انبیاء سیر فی اللہ اور جمع الجمع کہتے ہیں۔ لہذا ناممکن ہے کہ کوئی ولایت اولیاء سے پہلے ولایت انبیاء حاصل کر سکے۔ اب اگر ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کی ترتیب وہی ہے جس کی مدعی تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم ہے تو ہر ظاہری و باطنی اصول سے غلط ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بحث بھی کی جاتی ہے۔ کہ ولایت کا درجہ نبوت سے افضل ہے یا نہیں؟ یہ سوال نبی کی ولایت اور نبی کی نبوت کے متعلق ہے۔ ہر نبی پہلے منزل ولایت طے کرتا ہے۔ اس کے بعد اسکو نبوت تفویض کی جاتی ہے۔ اسلئے نبی کی ولایت کو نبی کی نبوت پر یقینی تفوق حاصل ہے۔ ولایت نبی کی صفت ہے۔ اور نبوت نبی کا عہدہ ہے۔ اسی صلابت ولایت

کی وجہ سے اُسے نبوت کا عہدہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا صفت کو عہدہ پر ترجیح ملنا چاہیئے جہانتک ولی کا تعلق ہے تو ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء دونوں مجاہدے اور صفات ہیں۔ اس میں کسی کو بھی عہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ولایت اولیا میں نبی کے سے اختیارات و حقوق مل جاتے ہیں۔ مگر ایسے ولی کو نبی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ اِن حقوق کے ذریعہ نبی کا اتباع کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کے علاوہ نبی معصوم ہوتا ہے اور ولی محفوظ ہوتا ہے۔ اندریں اشکال مشابہت و مطابقت کی وجہ سے ولی و نبی کو مساوی و برابر بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ایسا سمجھنا نہ صرف بے ادبی ہے بلکہ کفر ہے:۔

اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے قدیمی طرز و طریقے کو چھوڑ کر ولایت انبیاؑ کو مقدم کبھی نہیں سمجھا اسلئے شاہ اسمٰعیل کے نئے خیالات اور جدت طرازیوں سے شاہ عبدالعزیزؒ کا کوئی تعلق نہیں۔ اور شاہ اسمٰعیل کو تحریف کر لینے میں کمال بھی حاصل ہے۔ شاہ اسمٰعیل کی طباعی و ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ بہک گئے۔ ان کی نکتہ آفرینیاں فقہی مسائل میں کوئی معنی رکھتی ہوں۔ مگر انہوں نے غضب کیا کہ طریقت میں بھی اپنے علم معقول سے کام لیا۔ سب سے زیادہ کفرانِ نعمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی طبع آزمائی کا تختۂ مشق شاہ صاحبؒ کو بنانے کی کوشش کی۔ اور یہی روشنیٔ طبع سید صاحب کیلئے بلائے جان ثابت ہوئی۔ جو مژدہ وقتِ بیعت شاہ عبدالعزیزؒ سے دلوایا۔ اگر منجملہ پیشین گوئی ہے تو خیر ورنہ قطعی جھوٹ اور مہمل ہے۔ ولایتِ اولیا کو محذوف کرکے ولایتِ انبیاء پر جست لگانا ناممکن العمل اور خلافِ فطرت ہے۔ بغیر معرفت حاصل کئے ہوئے کفار یا سلاطین جائر سے جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ جہاد اکبر منطق و فلسفہ کے زور پر ختم کر دینا مشتے بعد از جنگ کا مصداق ہوگا۔ یعنی گوشہ گزینی اختیار کرکے ٹھنڈے ٹھنڈے آغوشِ

لحد میں آرام فرمایئے۔ یہ اسمٰعیلیہ تشبیہ کو گوارا نہیں کرتے، اور تنزیہ میں انتہائی غلو اختیار کرتے ہیں۔ یہی ان کے نزدیک محبت الٰہی کا بہترین ثبوت ہے صفات کو نظر انداز کر کے محض جامد اسم کے درپے ہو جانا، در اصل خلاف شانِ اسلام ہے۔ شانوں اور صفتوں سے حرکت و حیات ثابت ہوتی ہے۔ اور اسم جامد ہی کو بُت کہا جاتا ہے۔ صفتوں کا صرف منہ سے اقرار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ ان شیئون و صفات کی خود سیر نہ کی جائے اور حامل نہ بنا جائے۔ یہ سیر لامتناہی ہے۔ کیونکہ اسم ذات کی صفات کی نہ حد ہے نہ نہایت۔ ولایتوں کی ترتیب بدل دینے کا اگر عملی تجربہ کیا جائے تو منزل ہی طے نہیں ہوتی ہر مقام پر نئی نظر آئیگا کہ ۔۔۔ ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است ۔۔۔ یہ سبب من گھڑت سید صاحب کو ان کی کمی کی وجہ سے کامل بنانے کے لئے ایجاد کی گئی ہے۔ اور دنیا کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ مقالات سرسید جلد ۱۶ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سید صاحب نقشبندیہ دستور کے مطابق مرید بنائے گئے اور خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ سوانح نگاروں کی منطق نو ایجاد نے سید صاحب کی جامعیت کو محدود و تنگ بنا دیا ہے اور درخشاں ستارے کو معمولی سے قطرۂ آب کے اندر مقید کر کے دکھایا ہے۔ ——— پہلے ہی قدم پر ان کو نہ صرف ولایت انبیاء سے متزین کر دیا ہے بلکہ امام معصوم اور نور بھی مشہور کر دیا ہے۔ اور مہدی بھی بنا دیا ہے[1] وہ جو کچھ بھی بنائیں مگر مادر زادی رسمی علوم کے مباحث سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس کا ذریعۂ معلومات علم معقول سے علیحدہ ہوا کرتا ہے وہ مدرسہ والوں کی خوبو نہیں رکھتا۔ وہ اپنی روحانیت کے سامنے ان واجبات فروعی مسائل

---

[1] ملاحظہ ہو نواب صدیق حسن کی "اربعین" اور ولایت علی صادق پوری کا رسالہ تسعہ، اور جعفر تھانیسری کی برکات اسلام

پر توجہ نہیں کیا کرتا۔

اعتراض سے بچنے کے لئے خواہ مخواہ سید صاحب کو ظاہری تعلیم سے مبرّا ثابت کرنے کی بھی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اور جب اطمینان نہیں ہوا۔ تو باطل پرستی کی آڑ لے کر شہرت دیدی کہ نعوذ باللہ من ذٰلک سید صاحب کمال مشابہت پر حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخلوق کئے گئے تھے۔ اسی سبب سے بے علم رہے۔ اسی لئے انہیں "اُمّی" سے ملقب اور علم لدُنّی سے متصف کیا گیا۔ پھر اسی بنیاد پر نبوّت سے ملا کر ان کے مرتبہ کو نبوت کے برابر ظاہر کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ رسول ہاشمی صلعم علیہ وآلہ کا اُمّی ہونا بے مثال معجزہ ہے۔ پھر حیرت ہے۔ کہ اسمٰعیلیہ اپنی موحدیت کے باوجود عجائب پرستی و تشبیہ کی تقلید کیسے کرنے لگے معتقدین نہیں سمجھتے کہ جناب سید احمد صاحب سے روزِ حشر ان خطابات وکرامات کے متعلق جب پرسش ہوگی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ صاف فرمادیں گے کہ میں ان پرستاروں سے بَری ہوں، وران بذبانات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

---

(۴)

بیعت کے بعد

سید صاحب کا دہلی میں قیام تقریباً ڈیڑھ سال رہا۔ کچھ دن ظاہری تعلیم میں صرف ہوئے۔ کچھ دن مجاہدے کئے اور کچھ دن شاہ عبدالعزیز کی صحبت میں رہے۔ گوشہ نشینی کی زندگی خاموش زندگی تھی۔ مدرسہ والوں سے رسم و راہ پیدا نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ شاہ اسمٰعیل بھی اپنے اس شاگرد کو ناقابل توجہ سمجھے۔ آخرکار ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ میں سید صاحب وطن مالوف کو تشریف لے گئے۔ یہ وہ سال ہے جبکہ روسی حملہ کی خبر سن کر تیموری شاہزادہ زمان شاہ لدھیانہ سے کابل گیا ہے اور اسی سال زمان شاہ کے گورنر رنجیت سنگھ نے کشمیر ملتان اور پشاور پر تسلط جما کر پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد ڈالی ہے۔ وطن والوں نے جوش و مسرت سے سید صاحب کو خوش آمدید کہا۔ مسرت اس بات کی تھی کہ ان کا لاابالی پن سنجیدگی سے بدل گیا تھا اور ان کے حرکات و سکنات سے تہذیب و اخلاق ظاہر ہونے لگے۔ وہ نہ صرف خود پابند شریعت ہو گئے تھے بلکہ دوسروں کو بھی پابند شرع بننے کی نصیحت کیا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی مجذوبیت کی ایک جھلک ان میں دکھائی دیتی تھی۔ اہل خاندان نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کے گلے میں سنت پیغمبری کا طوق ڈال دیا کہ گریزپائی کا علاج ہو جائے اور گھر کی رونق میں اضافہ ہو۔ ان کی ازدواجی زندگی حوالہ قلم نہ کر کے ان کے سوانح نگاروں نے بڑی کم نظری و کوتاہ بینی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ البتہ سوانح احمدی میں اس قدر بتایا گیا ہے کہ ان دو برس کے ایام میں ایک صاحبزادی تولد ہوئی تھیں جن کے بطن سے اسمٰعیل[۹] پیدا ہوئے اور اس اہم واقعیت کو نظر انداز کر کے عجائب پرستی کے ڈھکوسلوں پر طبع آزمائی کی

ہے۔ مثلاً سیّد صاحب کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جسمی زیارت کی خواب میں سعادت حاصل ہوئی۔ نبی کریم صلو علیہ وآلہ وسلّم نے خواب میں تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے ان کے منہ میں رکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ہاتھ سے انہیں غسل دیا اور بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے خود اپنے دست مبارک سے انہیں کپڑے پہنائے۔ حضرت غوث الثقلینؒ اور خواجہ نقشبندؒ میں ایک مہینے تک برابر کشمکش ہوتی رہی کہ کون ان کو اپنی طرف جاذب کرے اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ دونوں ایک ساتھ اپنی اپنی روحانیت سے انہیں مستفیض فرمائیں اس سے پہلے قیام دہلی کے زمانہ میں کبھی سیّد صاحب نے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار مبارک پر اعتکاف کیا تھا تو ان کی روح پاک نے بہ حکم رب خود بخود نسبت چشتیہ عطا کر دی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان خوابوں کی اصلیت کیا ہے۔ مگر ان کے اظہار سے واقفانِ رموز خوش نہیں ہوتے مگر ان امور سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سید صاحب کی طرح ان کے معتقدین ان مقدس ہستیوں کے وصال کے بعد بھی ان کی فیض رسانی کے قائل ہیں۔ استغاثہ سے منحرف نہیں ہیں اور عالم برزخ کی حیات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو شخص ان حقائق کو نہیں مانتا وہ سیّد صاحب کی جماعت سے یقیناً خارج ہے۔ یہ خواب کچھ ہی ہوں مگر ان سے سید صاحب کے اعزاز و منزلت کا اظہار مقصود ہے۔ بہرحال وطن کے اس قیام میں ان کی وجدانیت میں ان کا اضطراب محسوس کیا جا سکتا ہے اور اعزا و اقارب کو اسی سے اندیشہ تھا۔ چنانچہ دو برس کے صبر و سکون سے وہ اُکتا گئے اور ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں جبکہ انگریزوں اور رنجیت سنگھ سے معاہدہ ہوا تھا۔ وطن سے ایسے گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی؟

براہِ راست پہنچے، یا براہ دہلی، مگر مالوہ میں نمودار ہوئے۔ اغلب یہ ہے کہ مرشد کی یاد یا کشش انہیں دہلی لے گئی ہو۔ وہاں سے مالوہ یوں پہنچے کہ یا تو الہام ہوا یا مرشد نے ہدایت کی یا بھائی کے پاس جانے کا خود شوق سوار ہوا۔ ان کے بھائی امیر خان کی ملازمت میں تھے۔ شاید مسجد کے امام تھے یا سپاہی تھے۔ ان کا نام کسی نے سید عبدالرحمٰن لکھا ہے۔ کسی نے ابراہیم بتایا ہے۔ ان کا انتقال سید صاحب کے پہنچنے کے بعد ہوا تھا۔ غرض سید صاحب کی موجودگی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں امیر خان کے جتھے میں پائی جاتی ہے۔ از راہ اعزاز ملکہ، امیر خان کو نواب کہا کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح وہ نواب مشہور ہو گئے تھے۔ امیر خاں کے یہاں کسی کی تنخواہ مقرر نہیں تھی۔ مال غنیمت مل جاتا تو عید ہو جاتی ورنہ محرم کا مہینہ رہتا۔ لشکری سید صاحب سے واقف نہ تھے مگر ان کے بے تکلفانہ انداز میں کشش تھی وہ ان سے خوش اسلئے تھے کہ وہ سب کی خدمت کرتے تھے۔ اور حیرت اس بات پر تھی کہ دور جنگل میں جاکر ریاضت و عبادت کیا کرتے تھے۔ سپاہی فال نیک سمجھ کر اپنے ساتھ اکثر مہم پر بھی لے جاتے تھے۔ ان کا وجود مسعود تھا۔ بعض سمجھتے تھے کہ وہ عامل ہیں بعض کا خیال تھا کہ انہیں کیمیا آتی ہے۔ کچھ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں علم نجوم و رمل آتا ہے۔ یا کوئی ہمزاد ان کے قبضہ میں ہے۔ تعجب تھا کہ وہ غیب کی باتیں کیسے بتا دیتے ہیں اور نئی نئی پیشین گوئیاں کیونکر کر دیتے ہیں۔ سید صاحب اپنی ترنگ میں کبھی نواب کی مجلس میں بھی پہنچ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حالت جنگ میں دشمن انگریز کے خیمہ میں بھی بے تکلفی سے داخل ہو گئے تھے اور وہ انگریز امیر خاں کی طرح ان کی باتوں سے محظوظ ہوا تھا۔ سوانح احمدی کی روایت ہے کہ

"اس افسر نے وعدہ کر لیا کہ میں نواب سے جنگ نہیں کروں گا، سرکار سے صلح کروا دوں گا"۔ ——— لشکری اپنے اپنے متعلق استفسار کیا کرتے

تھے۔ کبھی ان کے جوابات سچ نکلتے تھے اور کبھی نہیں۔ سید صاحب کے متعلق جو قیاسات کئے جاتے تھے۔ اُن کی صاف طور پر خود تردید کر دیا کرتے تھے۔ انہیں ان کے مرحوم بھائی سے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اسی لئے طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں ایک دہلی والے سپاہی نے حقیقت واضح کی کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے ان پر نظر ڈال دی ہے۔ ان ہی کے مونڈھے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر کس بہ خیال خویش خبطے رکھتا تھا۔ ہونے والی بات کہ نیپال والوں سے فارغ ہو کر انگریزوں نے بہت بڑی فوج لاکر یکدم مالوہ کے راجپوتوں کا محاصرہ کر لیا۔ اور اسی موقع پر امیر خاں اور انگریزوں سے ۱۸۱۷ء میں صلح ہو گئی جس کے بعد امیر خان کو ریاست ٹونک ملی اور باقاعدہ نوابی کا خطاب ملا۔ کچھ لکھتے ہیں کہ یہ صلح سید صاحب نے کرائی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ اس صلح سے سید صاحب ناخوش تھے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صلح سے سید صاحب کو کیوں منسلک کیا جاتا ہے۔ مولا د والا شخص کو ان دنیوی امور سے واسطہ کیا تھا اور سیاست میں ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی یہ امر کہ فقیر اور ولی ہونے کی وجہ سے انہوں نے دعا کر دی ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔ مرزا حیرت نے کچھ ایسی ہی داستان لکھی ہے۔ لیکن یہ کہنا ہے کہ صلح سید صاحب کی مرضی کے خلاف ہوئی قطعی ناقابل قیاس ہے۔ یہ دونوں فریق اپنا اپنا ثبوت "وقائع احمدی" سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک کا کہنا ہے کہ سید صاحب نے امیر خان کو سمجھایا کہ صلح نہ کرو۔ مگر نواب کا یہ عذر تھا کہ لشکر کا سامان درست نہیں ہے۔ لشکر والوں میں اتحاد نہیں رہا ہے لہذا مصلحت یہی ہے کہ اس طرح دس پانچ لاکھ روپیہ انگریزوں سے لے لوں۔ اس کے بعد انگریزوں کی خبر لونگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا (وقائع)، اس دوران میں خبر ہوئی کہ میجر آکٹر لونی نواب سے ملنے آ رہے ہیں۔ تو سید صاحب آدھی رات سے لشکر میں پہنچ گئے (کہ صلح نہ کرنا) پھر بعد نماز فجر

سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتے ہوئے نواب مسجد سے باہر نکلے۔ سید صاحب نے آخری مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی صلح مناسب نہیں ہے۔ مگر نواب نے پھر وہی جواب دیا کہ اس وقت ملاقات مناسب ہے۔ میں انگریز سے عہد کر آیا ہوں اسکو نہ توڑونگا (وقائع) اس داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں ہوئی بلکہ رسماً ٹالنے کیلئے یہ فقرے کہہ دیئے گئے۔ ورنہ پھر سید صاحب کو کتنی ہمت تھی کہ نواب کو اصرار کرتے اور ولایت سے کوئی بات کہنا تھی تو صرف ایک مرتبہ کہہ کر بے نیاز ہو جاتے اور تقدیر الٰہی کا تماشا دیکھتے۔ ایسے بزرگ اصرار نہیں کیا کرتے۔ دوسری طرف وزیر الدولہ ہی کا قول پیش کیا جاتا ہے کہ سید صاحب جب لشکر میں پہلی مرتبہ آئے تھے تو اسی روز اعلان کیا تھا کہ:۔

"امیر خان کو ریاست ملے گی۔ نوابی ملے گی اور ہم کچھ عرصہ کے بعد
مجاہدین کا لشکر لے کر اس ریاست سے ہم گزریں گے۔"

مگر اس مجذوب کی بڑ کے کوئی کیا معنی سمجھ سکتا تھا۔ اب اس پیشین گوئی سے نتیجہ نکالا گیا کہ صلح ان کے ہی ارشاد کے مطابق ہوئی تھی۔ روایت بقول مرزا حیرت "حیات طیبہ" میں یہ درج ہے کہ:۔

"بیچ میدان جنگ میں خیمہ نصب کیا گیا تھا اس میں تین کے درمیان گفتگو ہوئی تھی یعنی نواب سید صاحب اور لارڈ ہیسٹنگز۔ سید صاحب نے بڑی مشکل سے نواب کو شیشے میں اتارا تھا۔ کہ اپنی اولاد کی منفعت ہی کی خاطر صلح کر لینا چاہیئے مرزا حیرت کا یہ بھی بیان ہے کہ اسی وجہ سے لارڈ ہیسٹنگز سید صاحب کا ممنون تھا اور ہمیشہ تعریف و توقیر کیا کرتا تھا۔ یہ سب واہمہ کی شگوفہ کاریاں ہیں اور چنڈو خانہ کی گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اس صلح کے متعلق ملفوظات شاہ عبدالعزیز کی روایت قرین عقل ہے۔ اس میں کہا ہے کہ ایک شاہی عہدیدار

اپنی مفلسی و بے بسی کی فریاد کرتے ہوئے دعا کے لئے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ قرآن شریف سے فال لینا چاہیئے۔ چنانچہ آیات سے مطلب یہ نکالا گیا کہ "جانب جنوب تمہیں سفر کرنا چاہیئے، چودہویں منزل پر مسلمانوں کی بستی آئے گی۔ وہاں کی مسجد میں قیام کرنا، ممکن ہے کہ چند فاقوں کی نوبت آجائے۔ مگر گھبرانا نہیں، پھر اللہ کے فضل و کرم سے خود بخود بہتری کی صورت پیدا ہو جائے گی۔"

غرض ہو بہو ایسا ہی ہوا، چودھویں منزل پر پہنچ کر امیر خاں کے یہاں مسجد میں امیر خاں سے ملاقات ہوئی۔ خوش اخلاقی سے مختلف مسائل پر ان سے گفتگو ہوئی اور بڑی دلچسپی سے دیر تک ہوتی جس سے ان مسافر کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ قاعدہ تھا کہ ہر مہمان کی تواضع کی جاتی تھی۔ مگر اس مرتبہ اپنی سراسیمگی کی وجہ سے امیر خان ان دہلی والے مہمان کے متعلق کھانے کا انتظام کرنا بھول گئے لہذا دو تین فاقوں کی نوبت آگئی۔ جب اپنی مجلس میں انگریز سے صلح کرنے کے متعلق اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔ (اور ان مشیروں میں سید صاحب شامل نہیں تھے) اور کوئی قطعی رائے قائم نہ ہو سکی۔ تو امیر خان کو دہلی والے مسافر کا خیال آیا انہیں بلا کر ان کی رائے دریافت کی۔ مسافر صاحب نے برجستہ فرمایا کہ "الصلح خیر" بس فیصلہ ہو گیا۔ پھر ان ہی صاحب کو سفارت کے تمام لوازم فراہم کر کے اور پانچسو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کر کے بہ حیثیت اپنے سفیر کے میجر آکٹرلونی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اس طرح صلح ہو گئی۔ دہلی پہنچ کر یہ صاحب سیدھے شاہ صاحب کی خدمت میں سلام کو پہنچے اور عرض کیا کہ آپ کی دعا سے میرے دن پھر گئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا یہ قرآنی فال کی برکت ہے، نہ کہ میری دعا کی۔ میجر آکٹرلونی دوبارہ دہلی کا ریزیڈنٹ ۱۸۱۸ء میں مقرر ہوا تھا اور ۱۸۲۵ء

تک رہا۔ بہرحال اس صلح کے متعلق سید صاحب کا تذکرہ بے معنی ہے۔ تذکرہ نویسوں کی یادہ گوئی کا نہ املا درست ہے اور نہ انشا صحیح ہے۔ تاریخ اس صلح کے متعلق واضح بیان رکھتی ہے۔ مالوہ میں لارڈ ہسٹنگز نے اپنے مخالفین کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ امیر خاں کے سرپرست مرہٹے جب منہ موڑ گئے تو امیر خاں کے سامنے صلح تھی یا موت! اس لئے صلح کو پسند کیا۔ سید صاحب کی ولایت و کرامت سے جب کچھ نہ ہو سکا تو آخر وہ کیا کرتا۔ بیشک وہ بغیر صلح کئے ہوئے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں کون سرپھرا خیال کر سکتا ہے کہ امیر خان صلح پر آمادہ نہ تھا۔ یہ واقعہ ہو گا کہ سید صاحب بعد نماز فجر امیر خاں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلے۔ ان کی اس وقت کی گفتگو کا ماحصل یہی ہو سکتا ہے کہ نواب نے اس طرح انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت کر دیا۔ یہ ملاقات الوداعی تھی جس کے بعد سید صاحب دہلی کو روانہ ہو گئے۔ سید صاحب نے جو خط شاہ صاحب کو لکھا تھا اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ یہاں نیا انتظام ہو گیا۔ اب میں آپ کی خدمت میں حاضر آنا چاہتا ہوں۔ گویا شاہ صاحب کے حکم سے یہاں آئے تھے۔ اب واپسی کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ اس خط کو صحیح مانا جائے یا یار لوگوں کی ایجاد سمجھا جائے۔

تذکرہ نویسوں کی یہ بڑی بھاری چوک ہے کہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان سات برس میں یعنی اوائل ۱۲۳۳ھ؁ ۱۸۱۸ء تک سید صاحب سے اور شاہ صاحب سے کوئی ربط و ضبط رہا یا نہیں۔ اور یہ بھی اشارہ نہیں کیا کہ سید صاحب کے خاندان والوں نے سید صاحب کے متعلق کوئی تجسس کیا یا نہیں اور سید صاحب کو اپنی اہلیہ اور بچی کی یاد آئی یا نہیں۔ مرزا حیرت دہلوی نے حیات طیبہ میں اتنا ضرور لکھا ہے کہ سید صاحب لشکر سے چندہ جمع کر کے مدرسہ رحیمیہ دہلی کو بھیجا کرتے تھے۔

مزید براں یہ خط جو سید صاحب سے منسوب ہے کہ انہوں نے دہلی آنے کی شاہ صاحب سے اجازت طلب کی۔ مظہر ہے کہ شاہ صاحب سے سلسلہ قائم رہا۔ ان سات برس میں سید صاحب کو نہ سیاست کا کوئی علم تھا نہ مبلغ بننے کا تصور تھا اور نہ ان کو معلوم تھا کہ جہاد کیا شے ہے۔ اس کے کیا مسائل ہیں یا آئندہ چل کر انہیں کسی حکومت سے بھی جہاد کرنا ہے۔ اور وہ یقیناً سکھوں کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔

صاحب سیرت سید احمد شہید نے قیام مالوہ کے متعلق ہر خرافات سے بچ کمالات کا اظہار مختصر اور مبہم طور پر کیا ہے۔ سوانح احمدی میں کرامات کی بھرمار ہے اگرچہ جعفر تھانیسری کا یہ دعویٰ ہے کہ:-

"قیمتی کراماتی واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن چار سو صفحوں پر سوانح احمدی کی بنیاد ہے وہ از سر تا پا "قیمتی کراماتی واقعات" پر مشتمل تھے جن کا عطر نکالا ہے۔

مگر مولانا غلام رسول مہر صاحب نے اپنے عالمانہ افکار کو کمال و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور تاویلات سے کام لے کر اعتراضوں اور خامیوں کو نباہنے کی کوشش فرمائی ہے اور اپنے استدلال سے کرامتوں کو قابل قبول بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنی خیالی تصویر میں رنگ بھرے ہیں۔ مگر تماشا ہے کہ عجائب پرستی کے ملزم بن گئے۔ کرامتیں جو پیش کی ہیں ان میں آورد نمایاں ہے۔ واقعات جو درج کئے ہیں ان کی تاریخ روادار نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں اپنے قلم کا زور دکھا کر وہ یہ جتا رہے ہیں کہ ——— منم کردہ ام رستم داستاں۔

واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب کا درجہ ان رنگ آمیزیوں سے بلند و بالا ہے اور ان کی روحانیت کو غلط انداز میں یوں پیش کیا کہ ان حضرات کو روحانیت سے واقفیت نہ تھی۔ لہٰذا چل ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ سنا ہے۔ کہ

"مجموعۂ مکاتیب بریلی" میں صرف وہی خطوط ہیں جو سید صاحبؒ اپنے ازواجؒ کو لکھے ہیں کاش کوئی صاحبِ قلم واقفِ کار ان مکاتیب سے اخذ کر کے سید صاحب کی خانگی زندگی پر بھی تبصرہ کر دیں۔ ان مکاتیب کے اقتباس سے سید صاحب کی زندگی و مزاج کے متعلق بہترین روشنی حاصل ہو سکے گی، اس پر توجہ نہ کرنا بہت بڑا ستم ہےؒ۔ اس کو ظاہر نہ کرنے کے یہ معنی ہیں

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

لہ جناب مہر صاحب کے خزینۂ معلومات میں یہ مکاتیب ضرور ہونگے اگر وہ ضعیف العمری کی وجہ سے معذور ہوں تو تبصرہ کرنے کیلئے مجھ حقیر کو ازراہ کرم مرحمت فرمادیں۔

(۴)

مذہبی انقلاب

زاہد ز دیں برآمدہ صوفی ز اعتقاد
ز ساحری شد و عاشق بہاں کہ ہست

شام و سحر کی دونوں شفقوں کے درمیان کی تاریکی چھٹ گئی تو پو پھوٹتے ہی معلوم ہوا کہ مغلوں کی شہنشاہیت کا ستارہ ڈوب گیا اور انگریزوں کی قسمت جاگ اُٹھی۔ تحریک ولی اللّٰہی کو شاہ عبدالعزیزؒ خوبی سے چلا رہے تھے کہ اتنے میں شاہ اسمٰعیل نے سید احمد رائے بریلوی کی سرکردگی میں اپنی جودت سے نئی راہ نکالی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف میں کچھ ایسی ہوا چلی تھی کہ دُنیا کے ہر حصہ میں اصلاحات و ایجادات ہونا شروع ہو گئیں ۔

ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے۔ اقتصادی بُحران انقلاب کا باعث ہُوا۔ یورپ میں اس کے دفعیہ کے لئے سائنس ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ضعیف البنیان انسان خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس جدوجہد میں انگلستان کو تمام یورپ پر سبقت و فوقیت حاصل ہوئی۔ فیکٹری سسٹم کی ایجاد اور دولت کی افراط نے تہذیب و تمدن میں چار چاند لگا دیئے ۔

فرانس اپنی فوجی قوت سے غیر منتظم اور مائل بہ تنزل ریاستوں پر اپنا سکہ جما رہا تھا۔ مگر اب اس کی فوجیں ملک ملک مساوات، آزادی اور اخوت کا جھنڈا لے کر جانے لگیں۔ یورپ کے پرانے آئین اور محدود اصولوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ نپولین نے نہ صرف یورپ سے اپنا کلمہ پڑھوایا بلکہ انگلینڈ کا بھی

اپنے سامنے سر جھکانے کی کوشش کی۔ اس کی کامیابیوں کا شہرہ تمام ایشیا میں پھیل گیا۔ ان انقلابات سے مغلسی، آمریت اور محکومیت کے تخیلات کے بجائے قومیت پروان چڑھنے لگی۔ یورپ میں والٹیئر، روسو، کانٹ اور دیگر مصنفین نے تصورات، جذبات اور اخلاق میں نئی روح پھونک دی۔ ورڈسورتھ شاعر ایڈم اسمتھ ماہر اقتصادیات اور فلاسفر بنیتھم نے ان رجحانات کو قبول کر کے گزشتہ، موجودہ اور مستقبل کے لحاظ سے علمی و فنی حکمت، اخلاقیات اور کمالیت کے سبق دے کر قومی زندگی کی اصلاح کی۔ برک قدیم وضع اور رسم و رواج کا حامی تھا۔ مگر اس کے ساتھ بنیتھم فراخدلی کی تعلیم دیکر بنی نوع انسان کو بے پایاں مسرت کے حصول کی تلقین کر رہا تھا۔ برک نے دستور قدیم کی حمایت کی اور بنیتھم نے ترقی پسندوں کی جماعت بنائی۔ انگلستان والوں نے دونوں کو سراہا اور دونوں سے استفادہ کیا۔ ان فلسفیانہ تحریکات کا اثر مذہبیت پر پڑنا لازمی تھا لہذا مذہبی جماعتوں میں تحقیق و تجدید کا جذبہ اُبھرا۔ عہد جہود کے مذہب پرست چرچ کے قائل تھے۔ مگر اس کو منجانب اللہ نہیں مانتے تھے۔ اور ہر قسم کی برائیوں کے عادی تھے لہذا ان پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ ویزلی اور وہیٹ فیلڈ نے ان تمام خرابیوں کے دُور کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور ان کی تحریک "میتھوڈزم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ دونوں نے اپنی جوشیلی تقریروں اور وعظوں سے زہد و تقویٰ کی اشاعت کی، ترک دُنیا کی مذمت کی، ضمیر کی صفائی اور روحانی پاکبازی کی تعلیم دیکر گناہوں کے کفارے اور تقدس کا سبق پڑھایا۔ اُن کو دیہات و قصبات میں مقبولیت حاصل ہوئی اس تحریک کے مورخ کا بیان ہے کہ اگر میتھوڈزم یا اسی قسم کی کوئی تحریک وجود میں نہ آتی تو انگلستان قعر مذلت سے کبھی نہ نکل سکتا۔

میتھوڈزم کے ہمعصر "ایوینجیکل" چرچ کے مؤید تھے۔ اور ان کی جماعت بہترین

طریقہ سے منظم و متحد تھی۔ یہ لوگ چرچ کی دوسری جماعتوں کے برخلاف اپنے مخالفین پر تشدد کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا اثر اونچے اور درمیانی طبقات پر بہت تھا۔ اسی لئے عوام ان سے خائف تھے۔ ان میں کی ایک جماعت "کلیپیہم" کہلاتی تھی۔ رسم غلامی کا دشمن دلبرفورس اور مشہور شاعر کوپر اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے ان کے اصول کے مطابق ہر انسانی مفاد کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور دنیا کا ہر مذہب ان کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔[۱]

مدعا یہ کہ یورپ کے انقلابات اس کی ترقی کا باعث ہوئے۔ مگر یہاں ہندوستان میں ترقی معکوس ہوئی۔ اقتصادیات اور مالی حالت بگڑ جانے کی وجہ سے اول تو اصلاح نہ ہو سکی۔ اور اگر ہوئی بھی تو ناقص و بیکار۔ ہدایت و اصلاح کا کام علماء کے سپرد تھا اور یہ علماء نئی سیاست اور تبدیل ہونے والی اقتصادیات کو سمجھ نہیں سکے اور ان کی توجہ عقائد کی ہی اُدھیڑ بُن اور کاٹ پھانس پر مرتکز رہی۔ مثال کے طور پر شاہ اسمٰعیل کی تحریک ذاتی نہیں تھی۔ بلکہ تقلیدی تھی۔ ایک مرتبہ ابن تیمیہ کسی حنبلی عالم سے مباحثہ کر رہے تھے۔ باوجودیکہ خود حنبلی تھے۔ دوران مباحثہ میں ان کی دلیل سُن کر حنبلی عالم نے یہ کہا کہ بحث ختم کیونکہ یہی دلیل حضرت امام احمد حنبلؒ نے ارشاد فرمائی ہے۔ یہ سُن کر ان کی جان جل گئی اور فرمایا کہ اگر یہی دلیل بقیہ سب اماموں کی بھی ہو تو میں کہوں گا کہ یہ میری ذاتی تحقیق ہے۔ میں تقلید شخصی کا قائل نہیں ہوں۔ یہ جرأت شاہ اسمٰعیل ہی میں نہ تھی لہٰذا وہ مقلد ہی کہے جا سکتے ہیں۔ ان سے پہلے بعض جدت پسند اسی تعلیم کا ادعا و اجرا کر چکے ہیں۔ چنانچہ ابن تیمیہ کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سو برس بعد اور زوال بغداد کے پانچ سال بعد حران میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی والدہ ماجدہ سے تعلیم ابتداً میں پائی تھی۔ جو

---

[۱] ماخوذ از ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا مصنفہ تارا چند صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۲۔

بڑی ذی علم تھیں۔ اور ان کا اسم گرامی تیمیہ تھا۔ ان کے ہی نام سے یہ خاندان مشہور ہوا۔ ابن تیمیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے، قلم سے، اور تیغ سے جہاد کیا۔ زبان وقلم نے دوست کم بنائے اور دشمن زیادہ۔ چنانچہ قیل وقال کی وجہ سے متعدد مرتبہ قید وبند سے سابقہ پڑا مگر ان کی شمشیر آبدار نے حملۂ دمشق کے موقع پر اپنے جوہر دکھائے۔ اور تاتاری غازان خان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کے مذہبی اجتہادات کی مختصر فہرست یہ ہے۔

۱۔ اسلام کو قرونِ اولیٰ کے رنگ میں پیش کیا۔ وہ خود حنبلی تھے مگر آزاد فکر تھے۔

۲۔ ائمہ اربعہ کے اجتہاد کے قائل نہیں تھے۔ اور تقلید شخصی کے مخالف تھے۔ مگر عوام کو تقلید کی اجازت دی۔

۳۔ قرآن کے لفظی وظاہری معنوں سے استدلال کرتے تھے اور تاویل کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

۴۔ باری تعالیٰ کی تجسیم کے قائل تھے اور فلاسفہ کے اعتراضوں کو نہیں مانتے تھے

۵۔ عقائد اور معاشرہ میں نئی باتوں کی تردید کرتے تھے اور قرونِ اولےٰ کی تقلید کے قائل تھے۔ اس کے خلاف کو بدعت کہتے تھے۔

۶۔ زیارت قبور کے عدم جواز کا فتویٰ دیا حتیٰ کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار اقدس کی زیارت بھی ان کے نزدیک گناہ تھی۔ اعتراض ہونے پر شدِ رحال کی حدیث پیش کی کہ زیارت قبور کی نیت سے سواری وغیرہ کا انتظام نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے جائز ہے۔

۷۔ رسول کی دعا کے قائل ہیں مگر حیاتِ رسول تک ہیں۔ پھر بروز حشر رسول کی شفاعت کے منکر ہیں۔ اسی وجہ سے ندا کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اسلئے کہ ندا ذی روح کو کی جاتی ہے۔

۸۔ وسیلہ کو نہیں مانتے۔ سورۂ مائدہ آیت وسیلہ سے مُراد ان کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ اور تقویٰ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں وسیلہ کو امید و رحمت اور خوف و عذاب سے موسوم کرتے ہیں۔ (اپنی اس حرکت کو تاویل نہیں سمجھتے) اس کے علاوہ حدیثوں میں جو وسیلہ کا ذکر ہے۔ اس کو جنت کے ایک درجہ سے تعبیر کرتے ہیں؛

۹۔ تصوف کے قائل ہیں۔ صوفیائے متقدمین کو "سادات مومنین" اور "خیار المسلمین" میں شمار کرتے ہیں۔ صوفیائے متاخرین پر معترض ہیں کہ انہوں نے تاویل اور عقلیت سے کام لیا ہے۔ زہد و تقویٰ میں غلو کیا ہے اور وحدت الوجود سماع اور خلوت کے اضافے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خلوت سے معرفت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عقل و سمع سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ولایت کا حصول طاعات سے ہوتا ہے۔ ابدال وغیرہ کے وجود کو نہیں مانتے۔ عبادات شرعیہ اور عبادات بدعیہ کی تشریح کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مراقبہ وغیرہ غیر شرعی ہیں۔

۱۰۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ والی حدیث جو قرآن کے ظاہری و باطنی معنوں کے متعلق ہے۔ اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں جو معنوں کی تفریق ہے۔ اس کا مفہوم آئندہ ہونے والے ملاحم و فتن لیتے ہیں۔[۱]

۱۱۔ صوفیائے خام اور علمائے سوء کی بے طرح دھجیاں اُڑائی ہیں۔ رفاعیہ فرقے کے جاہلوں سے دو بدو مقابلہ کیا۔ فتنۂ عقائد کی تصحیح کی۔ عقلیت کی تردید کی تاتاریوں اور شیعوں کے خلاف جہاد کیا۔

ان کی تصانیف و تقاریر میں جدت و انفرادیت ہے۔ عقلی و نقلی لاجواب

[۱] ڈاکٹر اقبال کا بھی یہی خیال ہے۔

مباحثوں و[illegible] میں [illegible] کرتے تھے۔ مباحثوں میں شدت ہوتی تھی اور جوش میں زبان بے قابو ہو جاتی تھی۔ [illegible] غزالی اور امام رازی کی فلسفیانہ تاویلوں پر معترض تھے۔ [illegible] [illegible] علماء دمشق [illegible] [illegible]

[illegible] شاخ پر چڑھے جاتے ہو!

[illegible] کا [illegible]

[illegible]

ابن تیمیہ [illegible] سیاست [illegible] وسیاست کا [illegible] کامیاب نہ ہو سکا [illegible] ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۷۲۸ھ ۱۳۲۸ء [illegible]

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۱۵۶۳ء تا ۱۶۲۴ء

ان کے بعد حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا تجدد بھی قابل لحاظ ہے۔ مجدد صاحبؒ فاروقی خاندان کے گوہر شب چراغ ہیں حضرت کے والد علیہ الرحمۃ شیخ عبدالاحدؒ خاندان صابریہ میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حضرت مجدد نے حاصل کی پھر سیالکوٹ جاکر سترہ برس کی عمر میں جملہ علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد آگرہ میں درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ یہاں مذہبی امور کے متعلق حضرت مجدد و ابوالفضل وفیضی سے اکثر مباحثے کیا کرتے تھے۔ والدان کو شادی کے لئے وطن لے گئے۔ حضرت مجددؒ نے سب سے پہلے سلسلہ صابریہ میں اپنے والد ماجد سے بیعت حاصل کی۔ اس کے بعد سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مرید ہوئے۔ خواجہ صاحب ان کی قابلیت علمی اور استعداد روحانی کے معترف تھے۔ ۱۵۹۸ء میں خرقہ خلافت سے ان کو سرفراز کیا گیا۔ سفر مکہ معظمہ کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور ۱۶۰۱ء میں ستمبر میں مجددیت کے متعلق انہیں غیب سے اشارہ ہوا۔ جب حضرت خواجہ صاحبؒ سے ملاقات کرنے دہلی گئے تو مرشد نے عزت و احترام کے ساتھ استقبال کیا اور سرہند پہنچکر قبولیت عام حاصل کی۔

مسلمانوں کی حالت اور دین کی ابتری ملاحظہ کر کے حساس قلب پر بڑی بنی اور درستی و اصلاح کے لئے اپنا طریقہ مجددیہ جاری کیا۔ اس عہد میں علماء سوء اجتہاد و بدعت حسنہ کے حیلہ سے فسق و فجور میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اور صوفیائے خام نے کرامات کے پردے میں فریب سے کام لے کر دنیا کمانا شروع کر دی تھی۔ حضرت باقی باللہؒ اور حضرت محدث شیخ عبدالحق دہلویؒ اس ابتری کی اصلاح کرنے میں

معروف تھے۔ مگر مجدد صاحب کی صورت فوقیت رکھتی ہے۔ انہوں نے دین و تعلیم سلوک پر مقدم رکھا اور طریقت کے مقابلہ میں شریعت کی اہمیت ثابت کر کے ان کے بااثر طبقے امرا کو دینی ذہنیت کا پابند بنانے، دربار کے مسلمین کو اکبر کی بددینی اور جمہوری حضرات کے ذریعہ شاہ وقت کو بھی ترویج شریعت کی ترغیب دی۔ حضرت کے مکتوبات ان کی تعلیم سے پُر ہیں۔ ان کا طرۂ امتیاز یہ طریقہ نبوت ہے یعنی کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تکمیل ہوتی۔ دراحیائے سنت واجتناب بدعت حضرت مجدد کی خصوصیت ہے جزئیات تک میں آپ نے بزرگان اہل بتا دی ہے گویا ان کو شریعت کا ساتھی شمار کیا جاتا۔ وحدت الوجود کا مسئلہ مختلف فیہ تھا۔ سب سے پہلے آپ نے کشفی طور پر اس کی تردید کی اور اس کی بجائے بہ تقلید شیخ علاء الدولہ سمنانی وحدت الشہود کو رائج کیا۔ آپ کا قول ہے کہ جہاں تک شریعت ہے، شریعت سے آگے جانا نہیں۔ طریقت و شریعت کے درمیانی حجاب کو دور کر کے دونوں ایک ہیں۔ بلا وضاحت و تفصیل شیعہ مذہب کی تردید کی۔ رسوم بد کی اصلاح کی بدعتوں کو بھی ترک کرایا۔ مجدد صاحب اپنے علم روحانیت میں کمال رکھتے تھے۔ بقول خود تصوف اور اسلام کے متعلق اور عقلیت کی عملی رنگ میں انہوں نے تردید کی تھی۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے جزئیات کے متعلق تحقیقات وغیرہ اور شاہ جہاں اکبر کو کچھ غلط فہمیاں ہو گئی تھیں۔ شیخ محمدؒ نے ان سب میں احیائے سنت اور ترویج دین کا کام نہایت شان اور دلیری سے کیا ہے۔ وہ سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مجدد صاحب کے تمام رفقاء اور مجدد صاحب نسبت خاص رکھتے تھے۔ مجدد صاحب کے ان اطلاعات پر جن کا مفہوم حضرت صدیق اکبرؓ سے فضیلت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے ہمسری کا دعویٰ تھا۔ حضرت شیخ اور بادشاہ جہانگیر کو اعتراض تھا چنانچہ محدث صاحب نے ان سے جواب طلب کیا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ بعد میں محدث و مجدد میں ان اختلافات پر مفاہمت ہوگئی تھی۔ واللہ اعلم۔ مسئلہ وحدت الوجود بھی دونوں کے درمیان نزاعی تھا محدث صاحب ابن عربی کے مداح تھے فرمایا کرتے تھے کہ اس میں نجات کی ہے اور قیل و قال کی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دعویٰ الفی کا خبط بادشاہ اکبر، مجدد صاحب کے متعلق ابوالفضل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا ... سنہ ہجری میں تغیّر کر کے اس سنہ ہی کی ابتدا کی الفی ... ہونے کا اعلان ... طریق سے حضرت مجدد صاحب کے بعد میں ہو گیا۔ اور ... وہ مشہور و معروف ہیں جہانگیر کے ... کا ... حقیقت کا ... متعلق شیعہ حضرات ... لیکن جہانگیر نے ان سے جواب اس وقت طلب کیا جبکہ حضرت صدیق اکبر ... مجدد صاحب نے تاویل کر کے اور مثال دے کر اس دعویٰ ... لیکن یہ مطابقت کی دلیل بادشاہ کی سمجھ میں آنے والی نہ تھی۔ لہٰذا مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا گیا۔ واقعہ نظربندی کے سال بھر بعد جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ

"دریں ایام شیخ احمد سرہندی راکہ بہ جہت دکاں آرائی و خود فروشی و بے صرفہ گوئی روزے چند در زندان ادب محبوس بود بہ حضور طلب داشتہ خلاص ساختم۔ خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ و در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ او از روئے انصاف معروض داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایتے بود۔"

اس قسم کے مصائب ہر بڑے آدمی کو جھیلنے پڑتے ہیں اور اکثر والے الضبط وتحمل سے کام لے کر برداشت کرلیا کرتے ہیں لیکن ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے ... جمعیت ... حاجت ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا کی اصلاح و تجدید ایک ... نامہ ہے لیکن مسلک ابن تیمیہ اور مسلک شیخ مجدد بالکل الگ ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب اور مسلک وہابیہ ابن تیمیہ کے اصول سے ... حضرت مجدد ... ہندوستان ہی میں مقبول ہوئی لیکن عہد ... میں ... کی وجہ سے قریب قریب ... اور سلسلہ مجددیہ کی اشاعت برابر آج تک جاری ہے۔

ان خیالات کی ابتداء ابن تیمیہ نے کی ... تا ۱۳۰۶ ... ابن تیمیہ کو حکومت ... عبدالوہاب کو حکومت نجد کی پوری مدد ... تھی۔ ابن سعود ... امیر ... عبد عثمان نے ۱۱۵۰ھ میں اس کی دعوت قبول کی ... دی۔ دونوں کی یگانگت سے دونوں کو ... ہوا ... عبدالوہاب کے عقائد کی خوب اشاعت ہوئی اور امیر درعیہ کو ... کا نہیں موقع ہاتھ آیا۔ اس سے پہلے ابن تیمیہ ... دعوت قبول ... جلد ہی خلفائے ... سے منحرف ہو گیا تھا۔ ابن عبدالوہاب نے ... عقائد کا اعلان کیا تھا کہ "میں تمہارے پاس نیا دین لے کر آیا ہوں" پھر مقامات مقدسہ پر فوج کشی کی طائف، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کربلا کے تمام قبے و مشاہد منہدم کئے۔ روضہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا "ھذا صنم اکبر" یعنی یہ

لہ۔ حضرت شیخ مجدد کے بارے میں وہابیہ نے جو غلط فہمیاں پھیلا دی تھیں ان کو دفع کرنے کے لئے "مسلک امام ربانی" نامی کتاب مکتوبات شریف کی روشنی میں شائع ہو چکی ہے مطالعہ فرمائیں
(ناشر)

صنم اکبر کو مطلقاً نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی تصنیف "کتاب التوحید" میں لکھا ہے کہ "اگلے کافر لات و عزیٰ اور سواع کو پوجتے تھے اور یہ پچھلے کافر۔ محمد۔ علی اور عبدالقادر کو پوجتے ہیں لہذا یہ سب برابر ہیں۔"

(شان نبوی میں گستاخانہ خیالات بدتمیزی کے ساتھ گندے الفاظ میں ظاہر کئے ہیں) مشرک چونکہ واجب القتل ہیں۔ لہذا ابن عبدالوہاب والے کلمہ گویوں کو مشرک قرار دیکر قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور ان کے خیال میں وہ سب مشرک ہیں۔ جو ان کے ہم عقیدہ نہ ہوں۔

۱. علماء و ائمہ کے اقوال کو حجت نہیں سمجھتے۔ تقلید شخصی کے قائل نہیں ہیں۔

۲. قرآن و حدیث کا جو مفہوم بظاہر سمجھ میں آتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں مگر ابن تیمیہ اور ابن قیم سے استدلال کرتے ہیں

۳. ان کی تعلیم عقلیت اور یونانی علوم سے مبرا ہے۔

۴. تصوف اور اصطلاحات تصوف کا ان کے یہاں دخل نہیں ہے۔

۵. امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کا اظہار کرتے ہیں اور اجتہاد کے وہ مدعی نہیں ہیں۔

۶. توحید کامل کے قائل ہیں، صفات الٰہی کا اثبات کرتے ہیں، تشبیہ و تجسیم کے ساتھ تاویل کی بھی نفی کرتے ہیں۔ غیر اللہ کی خفیف سی شرکت کے شبہ کو خلاف توحید اور شرک سمجھتے ہیں۔

۷. غیر اللہ سے استغاثہ و توسل کو شرک مطلق خیال کرتے ہیں۔

۸. رسول اللہ صلعم کے وسیلہ کو نہیں مانتے . . . اور رسول کی دعائے شفاعت کے متعلق ابن تیمیہ کی طرح کہتے ہیں کہ رسول کو حیات میں یہ حق حاصل تھا۔ قیامت میں یہی حق پھر مل جائیگا۔ بعد وصال حیات النبیؐ کے قائل نہیں

ہیں۔ رسول کی عالم برزخ والی زندگی کے متعلق کہتے ہیں کہ ہماری یہ لکڑی بہتر ہے محمد سے اسلئے کہ یہ سانپ مارنے کے کام آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کام ہیں۔ محمد تو وفات پاگئے ان سے کوئی نفع نہیں رہا۔ وہ ڈاکیہ جیسے تھے۔ گذر گئے ! رسول کو وسیلہ مانتے بھی ہیں تو ذات رسول کو علیحدہ کرنے کے بعد۔ انبیاء وصالحین کی ذات کا واسطہ دینے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

۹۔ قبروں پر سلام جائز ہے لیکن درخواست دعا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔ زیارت قبور کو مشروع کہتے ہیں بشرطیکہ تجاوز نہ کیا جائے۔

۱۰۔ منکر کو مٹانے میں دریغ نہیں کرتے اسی لئے قبروں اور قبوں کا انہدام کرتے ہیں۔

۱۱۔ اسمائے صفات کے علاوہ کسی مخلوق کی پناہ لینا شرک ہے۔ غیر اللہ کی قسم خلاف توحید ہے۔

ابن تیمیہ کی طرح ابن عبدالوہاب کو بھی سلف صالحین کے عقیدہ پر سختی سے پابند رہنے کا دعویٰ ہے۔ یہ اپنے مخالفین کو کافر و مرتد تصور کرتے ہیں اور تشدد کو روا رکھتے ہیں۔ انہیں اصولوں کی وجہ سے اہل قبلہ کی تکفیر کا الزام اہل نجد پر لگایا جاتا ہے۔ مگر یہ لوگ جواب میں عمومی تکفیر کی تردید کرتے ہیں لیکن اتمام حجت اور تبلیغ کرنے کے بعد ہر ایک کی تکفیر و قتال کے روادار ہیں قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو یہ صرف عملی کفر نہیں سمجھتے جیسا کہ علمائے اسلام کفر عمل اور کفر عقیدہ میں امتیاز کرتے ہیں یہ لوگ محض توحید ربوبیت کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ توحید الوہیت کو بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ تمباکو نوشی کے خلاف ہیں مگر قہوہ نوشی کو جائز خیال کرتے ہیں۔ ان کی بد قسمتی یہ ہے کہ رسول علیہ الصلوۃ والتسلیم کی چند پیشین گوئیاں نجد کے متعلق ہیں۔ ان کے مشارالیہ یہی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کی اصلاح کی ہمعنان حکومت نہ تھی۔ لہذا مذہب پر سیاست کا غلبہ

رہا، مگر دونوں کے درمیان تفرقہ وجود میں نہیں آیا۔

ابن عبدالوہاب کے ہمعصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ / ۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) ہیں۔ کہتے ہیں یہ دونوں مدینہ منورہ میں ہم سبق رہ چکے تھے۔ ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپس آکر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے یہاں سببیت پسندی اور حقیقت پسندی دونوں کا رنگ موجود ہے۔ ان کا استدلال استقرائی بھی ہے اور استخراجی بھی۔ وہ مشائی و اشراقی مکاتیب کے متکلم ہیں، وہ مخالفین میں اتحاد پیدا کرتے ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اسی لئے ان کے افکار میں جامعیت ہے۔ [illegible] حنفی و شافعی اختلافات میں تطبیق کی ہے۔ شریعت و طریقت کے فرق کو دور کیا ہے۔ حدیث و فقہ میں راہ اعتدال [illegible] اہل دین اور اہل تصوف میں [illegible] قرآن و حدیث کی صراحت، تقلید[1] و جمود [illegible] فلسفہ کے ذریعہ [illegible] کہ اہل دین کی [illegible] ارباب عقل جزوی امور میں الجھ کر رہ گئے۔ مگر دونوں حقیقت سے دور ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے مغلیہ بادشاہوں کا زمانہ پایا اور خانہ جنگی کو بچشم خود دیکھا۔ سیاسی احوال میں ابتری تھی۔ علماء جہل و غوایت میں مبتلا تھے۔ فرقہ بندیوں کا زور تھا، مباحثوں کا شوق تھا۔ غرض ہندی مسلمان پر سیاسی، اقتصادی، معاشرتی و مذہبی تباہیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"زمانہ کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ مذہب کا سرچشمہ مکدر ہو گیا ہے۔ ہر وہ شے جو مسلمان کو ظاہری طور پر رونق دے رہی ہے۔ وہ حقیقت میں غیر اسلامی ہے۔۔۔" نصیحت فرماتے ہیں کہ "اپنے آپ کو پانچ قسم کے لوگوں سے بچاؤ۔ (۱) بے حیا صوفی سے۔ جو رفع حجت کے لئے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں تکلیف نہیں کرتا (۲) جھگڑالو معقولی سے جو شکوک و اوہام کا فتنہ پھیلاتا

---

[1] یہ گویا اشارہ ہے ابن تیمیہ اور ابن عبدالوہاب کے متعلق۔

ہے۔ اور خدا کا منقاد و مطیع نہیں ہوتا (۳) شیخی خور فقیہہ ہے جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔ (۴) خشک زاہد ہے جو دین میں اس درجہ تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بات کی اجازت ہی نہیں ہے۔ (۵) سرکش مالدار ہے جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں (اغیار) کی صورت اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کے ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ اپنے وصیت نامہ میں بھی بڑے بلند انداز میں لکھی ہیں۔ شاہ صاحب نے مخالفت کو ختم کر لیا۔ ساری مسلکوں کو سبیل وصول بنایا۔ فقہی اختلافات میں نقطۂ اعتدال سے کام لیا۔ نجدی تحریک یورپ والوں نے یہاں پھیلانا چاہی۔ مگر شاہ صاحب کی اعتدال پسندی نے اسے پروان نہیں چڑھنے دیا۔ تصوف سے متعلق یورپ کی رائے ہے کہ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاہ صاحب نے تجزیہ کر کے اس ناپاک خیال کو غلط ثابت کیا۔ ملا اور صوفی کا جھگڑا ختم کرنے کے لئے تصوف کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کیا۔ ظاہر ہے لطائف ثلاثہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک جوارح کی طرف اور دوسرا منبع کی طرف جوارح والے رُخ کی تکمیل کا نام شریعت ہے اور منبع والے رُخ کا حصول طریقت ہے۔ یعنی شریعت و طریقت ایک ہی شے ہے جس کے دو رنگ ہیں اور ان دونوں رنگوں سے وحدت حیات نہ صرف ثابت ہوتی ہے بلکہ قائم رہتی ہے اور اسی سے انسانیت میں مدارج کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے لطیفۂ جوارح کو اساس و بنیاد قرار دے کر صاحبانِ عقل و اخلاق کیلئے جو ترک دنیا کے قائل ہیں، سیاست میں داخل ہونے کا راستہ کھولا۔ انسانی اجتماعی زندگی میں ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے اقتصادی نظام میں اس امر کی تاکید سختی سے کی ہے کہ لطائف کی تکمیل کے لئے خاص وقت نکالا جائے۔ اقتصادی نظام

کی درستی سے انسانی اجتماعیت کی عقلِ مکمل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اقتصادی نظام بگڑ جانے سے اجتماعیت بگڑ جاتی ہے اور نفسا نفسی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب کے فلسفہ و تعلیم کی روح اور اصل اصول یہی حقیقت ہے۔ اسلامی شریعت کو دلیل و برہان سے ثابت کر کے مغربی الحاد کا منہ بند کیا۔ شیخ اکبرؒ کے وحدت الوجود اور مجددؒ سرہندی کے وحدت الشہود میں تطبیق کی کہ دونوں کی اصل ایک ہے فرق صرف نگاہ کا ہے۔ شاہ صاحب تعبیراتی اختلاف کو قابل توجہ نہیں سمجھتے قرآن کا ترجمہ اور حدیث کی اشاعت کر کے شاہ صاحب نے تعلیم اسلام کو مقبول بنایا اور پھر یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام انسان کے تمام امور معاش و معاد کی فلاح اور کامرانی کا ضامن ہے۔ اجتہاد اور تقلید کے طریقوں کو علیحدہ علیحدہ وضاحت کر کے سمجھایا ہے۔ توحید کی حقیقت پر روشنی ڈالی۔ شرک کو واضح کر کے اس سے بچنے کی تاکید کی۔ نظام حیات کے قواعد مرتب کئے۔ فلسفہ ارسطو حکمت نظری کی تعلیم دیتا ہے۔ عملی حکمت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اس کے مقابل میں عمل۔ خلق اور عقیدہ کی تشریح کی تاکہ امتیاز رنگ و قوم دور ہو اور اسلام کی جامعیت ثابت ہو۔ قومی زندگی کے لئے تدبر و تفکر کی راہ بتائی جس کی وجہ سے عالمگیر انقلاب وجود میں آ سکتا ہے۔ نظام حکومت کے اصول واضح کئے جن کے ذریعے اجنبی اور غیر حکمران سے بھی نجات مل سکتی ہے۔ اسی غرض کے لئے انہوں نے ۱۲۰۳ھ میں "جمعیت مرکزیہ" قائم کی جس کی شاخیں نجیب آباد، بریلی اور سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں کھولیں لیکن باوجود ذہانت رکھنے کے انکی تعلیم انکی زندگی میں مشہور نہ ہو سکی کتاب میں ہی بند ہو کر رہ گئی۔ اس لئے کہ فضا میں اصلاح قبول کرنے کی اہلیت باقی نہیں رہی تھی۔ ان کے فلسفہ کو عوام ہی نے نہیں بلکہ خواص نے بھی کما حقہ نہیں سمجھ پایا۔ معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصلاحیں

کی تھیں:۔

۱۔ نکاح بیوگان کا اجراء۔

۲۔ بڑے بڑے مہر باندھنے کی ممانعت:

۳۔ غمی و خوشی کے مواقع پر اسراف سے پرہیز۔ رسوم چہلم۔ چھ ماہی اور برسی نہ کرنے کی ہدایت۔

مذہبی اصلاحوں کی فہرست یہ ہے:

۱۔ اجتہاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ عوام کا کام نہیں ہے۔

۲۔ اختلافات میں تشدد کے مخالف ہیں اسلئے کہ اس سے تنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور دین کے معاملہ میں وسعت ہونا چاہیئے:

۳۔ عامی کو مجتہدین کا مقلد ہونا چاہیئے ورنہ نظام شرع درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن وہ تقلید کو اعتدال پر رکھنا چاہتے ہیں:

۴۔ نفی خودی کے بارے میں شارع سے انہیں اختلاف تھا:

۵۔ اختیارات ربانی پانے کے لئے جہاد کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان سے پہلے انکے والد شاہ عبدالرحیم نے آصف جاہ اول نظام کو مرہٹوں سے جہاد کرنے کی تلقین کی تھی۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ حکومت کرنے کی قابلیت اب افغانوں میں منتقل ہو گئی ہے۔ اسی لئے نجیب الدولہ کو آمادہ کیا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جائے۔ اس طرح گویا پانی پت کی فتح کے ذمہ دار شاہ صاحب ہی ہیں۔ اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں عقائد و عمل کی مکمل وضاحت کر کے شاہ صاحب نے صراط مستقیم دکھائی ہے:

شاہ صاحب کے وصال کے دو سال بعد شاہ عالم نے کمپنی بہادر کو دیوانی کے حقوق مرحمت فرمائے تھے۔ ان کا وصال لارڈ کلایو کے جانے اور میر جعفر

کے انتقال سے تین برس پہلے ہوا تھا[1]۔

شاہ ولی اللہؒ نقشِ اوّل تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ اسم بامسمّیٰ ہونے کے ساتھ نقشِ ثانی تھے۔ لکھا گیا ہے کہ:

"وے جامع علوم بلکہ آیتے از آیات الٰہی بود" اپنے والد کی تعلیم کی کمال سادگی۔ خوش اخلاقی اور عام فہم طریقے نے اشاعت کی وراثت ذہانت و فراست سے اس میں وسعت پیدا کی۔ عظمت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دہلی سے لیکر کلکتہ تک اور دہلی سے پشاور تک، شاگردوں اور مریدوں کا سلسلہ پھیل گیا۔ علمائے ہندوستان بغیر مشورہ لئے اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے اور نزاعی مسائل میں حجاز۔ روم اور شام کے علماء ان سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ حافظہ غضب کا تھا۔ تصنیف و تقریرات آپ کی بے نظیری کا پتہ چلتا ہے۔ آخر میں کثرتِ امراض کی وجہ سے جسمانی طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن برکاتِ باطنی اور حدتِ قوائے روحانی کی بدولت جب مسائل کی تفصیل بیان فرماتے تو ایک دریائے زخّار موجزن ہو جاتا۔ اور حاضرین و سامعین پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ منعقد فرماتے تھے۔ اور مخلوق مور و ملخ کی طرح جمع ہو کر رشد و ہدایت حاصل کرتی تھی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ باوجود بیماریوں کے حواس اسلئے قائم ہیں کہ خادمِ حدیث سے بیہودہ سرائی سرزد نہیں ہو سکتی۔ میں بچپن سے اسی کام میں ہوں۔ یہ بھی ارشاد کیا کہ تیس سال سے دین کا کچھ چرچا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بجز معقولات کے لوگ حدیث و تفسیر نہیں دیکھتے تھے۔ شاہ صاحب کی خدمت میں اجنّہ بھی بغرض استفادہ حاضر ہوتے تھے اور شاہ صاحب

---

[1] اسماعیلیہ نے بہت سی کتابیں خود لکھ کر شاہ صاحب کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ تاکہ لوگ اُن کے نام پر ہمارے دام میں پھنس جائیں (ناشر)

کی رسائی ارواحِ مقدسہ کی خدمت میں بھی تھی۔ ملفوظات میں ہدایت لکھی ہے کہ بزرگانِ سلف کی روحوں سے توسل و استمداد حاصل کرنا چاہیئے کہ اس میں ان کو بڑا دخل اور بڑی قوت حاصل ہے۔ آجکل زمانہ میں تو یہ بہت کمزور ہے۔ چار بزرگوں کو اس معاملہ میں خصوصیت ہے اور وہ زندوں کو توجہ و محبت سے امداد کرتے ہیں۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ (۳) غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی اور چوتھے کا نام نہیں بتایا۔ مگر ایک دوسری روایت میں حضور غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی کا نام بتایا ہے (ملفوظات عزیزی ص۱۲۷)

فرمایا شب برات میں نان یا حلوہ پر فاتحہ اور قبرستان میں فاتحہ پڑھنا معمول یا سنت ہے۔ [illegible] محمد حسن [illegible] مراد آبادی کے جواب میں فرمایا۔

فقیر کے مکان پر سال [illegible] دو مجلسیں ہوتی ہیں۔ محرم کی دسویں دن یا ایک دو دن پہلے۔ قریب [illegible] آدمی [illegible] جمع ہوتے ہیں [illegible] پھر بعد فاتحہ جو کچھ پاس موجود ہوتا ہے تقسیم کر دیا جاتا ہے [illegible] دوسری مجلس ربیع الاول کو اسی قدر آدمی جمع ہوتے ہیں۔ حال وفات شریف [illegible] و حلیہ وغیرہ بیان کرکے جو کچھ کھانا یا شیرینی ہوتی ہے اس پر فاتحہ [illegible] کر تقسیم کر دی جاتی ہے (ملفوظات)

ملفوظات میں یہ بھی ہے کہ نو بار دل میں [illegible] توجہ [illegible] عشرۂ محرم وغیرہ میں — حدیث کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر منہ رکھے ہوئے روتے تھے اس سے بزرگوں کے مزار پر بوسہ دینے کی جواز نکلتی ہے۔ مردے کے سرہانے پھول یا خوشبو رکھی جائے تو اسے پہنچ جاتی ہے۔ قبر کو سجدہ گاہ نہیں بنانا چاہیئے۔ بزرگوں کے نام پر بکرے وغیرہ ذبح کرنا ممنوع ہے۔ خدا کے نام پر کرکے ایصال ثواب کرنا چاہیئے شریعت مستقل طریقت کا نام ہے۔ فنا و بقا کا کمال یہی ہے کہ عشق و شوق کے

ساتھ شریعت محمدی کا اتباع کیا جائے۔ شیطانی خطرہ میں اصرار نہیں ہوتا۔ اور نفسانی خطرات پے در پے آتے ہیں۔ نفسانی خطرات زیادہ سخت ہوتے ہیں اس لئے کہ نفس انسان کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ جیسے مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ۔ نفسانی وساوس مشکل سے دفع ہوتے ہیں، کیونکہ نفس باقاعدہ منظم صورت سے جنگ کرتا ہے اور شیطان دور سے نظر آتا ہے۔ نفس کا سامان جنگ۔ عورت، اولاد لباس اور مال و متاع ہیں۔ شیطان ادنیٰ جنگ سے رفع ہوجاتا ہے اور نفس بڑی کوشش و دقت سے۔ دُنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ شیطان کا علاج ذکر اللہ۔ تلاوت قرآن ہے۔ اور دنیا کا علاج زہد و تقویٰ ہے۔ مخلوق کا علاج گوشہ نشینی ہے۔ مگر نفس کا علاج دشوار ترین ہے اور وہ یہ اشکل ہے نفس کی جو خواہش ہو، ہرگز اس کے مطابق نہ کرے۔ مگر شریعت کے اتباع میں اور وہ شریعت کام کرے عُجب و حسد شیطان کے داؤ ہیں۔ عُجب عبادت سے تعلق رکھتا ہے۔ طوائف و کلال عُجب کے مرض میں مبتلا کہاں ہو سکتے ہیں۔ (ملفوظات عزیزی صد ۱۳۴)

یہ سمجھنا چاہیئے کہ پیر کی اتباع سلوک ذکر و فکر میں ہوتی ہے اور معارف و مکشوفات خود اپنے ہوتے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو مجدد صاحبؒ اپنے مرشد کے نظریہ کے خلاف تھے۔ حالانکہ خواجہ باقی باللہ اور خواجہ عبید اللہ احرار رحمہما اللہ خالص وجودی نظریہ رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لوگ کم سمجھتے ہیں۔ تجلی اپنی جزا ولیا کے اوپر پرتو فگن ہوتی ہے جس سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں بعض اوقات صرف اپنے ہی وجود پر نظر ہوتی ہے۔ جیسے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ :-

"میں نے ہی حضرت نوحؑ کی کشتی کو ٹھیرایا تھا میں ہی قیامت کا باعث ہوں۔ میں زندہ رہونگا۔ مجھے موت نہیں آئے گی۔"

یا دوسرے بزرگ جو اپنے اندر تجلی الٰہی پاتے ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجلی ہی کا نظارہ کیا، پھر فرمایا میرا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے ہاتھ پر ہے۔ یا یہ کہ تو نے پتھر نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا ہے۔ درحقیقت ایک مٹھی سنگریزے ایک ہزار آدمیوں کی آنکھوں کو کیسے اندھا کر سکتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کو یہی معلوم ہوا کہ جو ہاتھ خدا کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہو اس ہاتھ سے شرمگاہ کو کیسے چھوا جا سکتا ہے۔ جس طرح دریا سے ایک کوزہ بھر کر پانی لائیں۔ جب برتن کی قید اور دریا کی جدائی پانی کو دیکھے گی تو تامل کرے گی کہ میں ہی ہوں جس میں کشتیاں جاری ہوتی ہیں۔ میں ہی دریا ہوں اور میں ہی اکبرآباد میں ہوں اور میں ہی سارنگ پور میں ہوں۔ غرض کہ اس قسم کی باتیں اس سے ظاہر ہوں گی، اسی کو تجلیات کہتے ہیں۔ وجودی شہودی سب ان تجلیات کے قائل ہیں اور یہ حال ہمیشہ ہر شے کی حقیقت میں ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم نہیں کہہ سکتے، یہ اور تحقیق ہے۔ اگر ذرا تامل کیا جائے تو ہر چیز کی نفس الامر تحقیق پر یہ موقوف نہیں ہے۔ بلکہ سلوک کی غرض و غایت یہ ہے کہ تجلیات الٰہی کا وجود ہے۔ اگر اس کا وجود نہ ہو تو دل کا وجود نہ ہو (ملفوظات عزیزی صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱)۔

شاہ صاحب نے اپنے عہد کی تصویر لطف کے ساتھ کھینچی ہے:۔

"اس زمانہ میں ملامتی ہونے کے لئے منہیات کے ارتکاب کی ضرورت نہیں بلکہ قرآن ہاتھ میں رکھنا اور قرآن و حدیث پر عمل کرنا ملامتی بننے کیلئے بس ہے۔ کیونکہ ایسے آدمی کو آجکل برا کہا جاتا ہے" (ملفوظات صفحہ ۱۹۴)

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں نصاریٰ کا تسلط ہوگا۔ ملک کفر کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔ مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔ اہلِ اسلام میں ظلم شائع ہوگیا ہے۔ اور ارشاد رسولؐ اللہ ہے کہ ان (نصاریٰ) کو مہدی علیہ السلام

قتل کریں گے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ عالم اور اکبر شاہ کے عہد دیکھے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۲۳ء میں استعفےٰ دیا تھا۔ اس کے سال بھر بعد شاہ صاحب کا وصال ہوا۔ فرمایا "امن صرف طاقت کے سہارے قائم ہو سکتا ہے۔ دنیادار ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔"

سیاست سے متعلق ان کے فتووں سے انکی وسیع النظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی تعلیم کا جب اجراء ہوا تو مسلمان اس کے خلاف تھے۔ مگر شاہ صاحب نے زیر و زبر بنا کر فتویٰ دیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں فائدہ ہے۔ انگریزی ملازمت کرنے کے متعلق فتویٰ دیا کہ جن شرائط سے جائز ہے۔ جلاوطنی کے بعد جب واپس آئے تو دہلی پر انگریزوں کا اقتدار ہو چکا تھا۔ بہادرانہ فتویٰ دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوتا۔ مگر تین چیزوں سے (۱) احکام کفر کے جاری کرنے سے (۲) دارالحرب کے متصل ہونے سے (۳) اس وجہ سے کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امن کے ساتھ جس طور سے کہ پہلے رہتا تھا نہ رہے یعنی جان کی ... مراد دارالحرب سے وہ شہر ہے کہ جن میں کفار کی حکومت کا حکم جاری ہو، ورنہ شہر اسلام کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اس شہر میں حکم امام المسلمین کا قطعاً جاری نہیں ہے۔ اور حکم نصاریٰ کے بے دغدغہ جاری ہیں۔ مراد جاری ہونے احکام کفر سے یہ ہے کہ معاملہ ملکداری و بندوبست رعایا اور خراج و باج و عشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق اور چوروں کی، اور فیصلے لڑائی جھگڑوں کے اور سزا گناہوں کی کفار بالجبر خود دیتے ہیں۔ ہاں اگر بعضے احکام اسلام کا مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبیحہ بقر کے تعارض نہ کرتے ہوں لیکن اصل اصول ان چیزوں کا ان کے نزدیک غلط و بیکار ہے

اسلئے کہ مسجدوں کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ذمی بغیر امن حاصل کئے ہوئے ان کے اس شہر میں اور اطراف میں نہیں آسکتا۔ اپنی منفعت کیلئے واردین اور مسافروں و تجار کی مزاحمت نہیں کرتے ہیں اور دوسرے اعیان مثل شجاع الملک اور ولایتی بیگم بغیران کے حکم کے اس شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس شہر سے کلکتہ تک عمل نصاری پھیلا ہوا ہے۔ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد لکھنؤ و رامپور نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں بوجہ مصالحت و اطاعت مالکان ان ممالک کے۔ (عہد نبوت اور حضرت عمر کے زمانہ میں دارالحرب بن جانے کی مثالیں ثبوت میں پیش کی ہیں)۔ (فتاوی عزیزی جلد اول۔ ص۱۷) لکھنؤ و رامپور دارالحرب نہیں بلکہ کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دارالحرب ہے۔ (ملفوظات عزیزی ص۱۲۳) ـــ یعنی اس فتوی میں شاہ صاحب نے انگریزوں کے ہی نہیں بلکہ سکھوں کے وحشیانہ و ظالمانہ طریقہ پر بھی توجہ فرمائی ہے شاہ صاحب ضعف زمانہ اور اپنی بیماریوں کی وجہ سے خود جہاد نہ کرسکے مگر جہاد کا فتوی دیکر جہاد کا راستہ کھول دیا۔ اس تحریک ولی اللہی کی تکمیل کی جس سے مذہبی و معاشرتی اصلاحیں جو شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھیں۔ [illegible] کی بنیاد کوشش کی اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی۔ شاہ صاحب کا وصال ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو ہوا۔ مومن خان نے تاریخ وصال کیا خوب کہی تھی۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے

فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و ادب۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے اولاد نرینہ نہیں تھی مگر اولاد معنوی بے شمار تھی تین صاحبزادیاں تھیں۔ ایک مولوی عبدالحی کو بیاہی گئی تھیں۔ دوسری کی شادی شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے مولوی عیسی صاحب سے ہوئی تھی۔ مولوی عیسی

کے حقیقی بھائی مولوی مخصوص اللہ تھے۔ تیسری شیخ محمد فضل کی زوجیت میں دی گئی تھیں۔ شیخ محمد فضل کے دو صاحبزادے شاہ محمد اسحٰق اور مولوی محمد یعقوب تھے شاہ صاحب نے اپنا ورثہ و ترکہ اپنی تینوں صاحبزادیوں کو دیا اور اس کے بعد شاہ محمد اسحٰق ان کے جانشین بنے۔

شاہ محمد اسماعیل

شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھائی شاہ عبدالغنی مجذوب طبع تھے [illegible] دہلی [illegible] مقبول تھا۔ ان کی خدمت [illegible] کیا کرتے تھے۔ ملخصاً [illegible] سرسید [illegible] ۲۶۰ [illegible] صاحبزادے شاہ محمد اسماعیل تھے جو ۱۲ ربیع الثانی [illegible] کو پیدا ہوئے تھے اور جن کی [illegible] تربیت شاہ عبدالقادر [illegible] عبدالعزیز کے زیر سایہ ہوئی۔ [illegible] علمائے ہند [illegible] جناب محمد ایوب قادری [illegible] شاہ اسمٰعیل [illegible] تعلیم [illegible] والد [illegible] پندرہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی۔ علم و فضل میں طاق اور ذہانت و فراست میں برق تھے کچھ دن مولوی عبدالحی کی شاگردی میں رہے تھے۔ اور بعد میں کچھ دن سید احمد رائے بریلوی کو بھی پڑھایا تھا ان کی تقریر دلکش تھی اور وعظ بے تکان فرماتے تھے شہسواری، سپہ گری، پہلوانی اور تیراکی میں کمال رکھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنا ترکہ اپنی صاحبزادیوں کو دیا تھا۔ اور وصال سے کچھ پہلے اپنا جانشین اپنے نواسے شاہ محمد اسحٰق کو بنایا تھا۔ ان حالات میں جو آنکھیں لگائے بیٹھے تھے انہیں ضرور مایوسی ہوئی اور سب سے زیادہ شاہ اسمٰعیل کو ہونا چاہیئے تھی جس کو شاہ صاحب نے یقینی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ شاہ رفیع الدین کے وصال سنہ ۱۲۳۳ھ سنہ ۱۸۱۷ء کے بعد شاہ اسمٰعیل مسند درس سپرد کرکے

ان کی تسکین کر دی۔ مگر وہ اس پر قانع ہونے والے نہ تھے۔ خود ذہنی حالت کے
ماتحت ان کی جدت طراز طبیعت اپنے لئے نیا راستہ [illegible]
[illegible] تھی۔ تاکہ وہ اپنے شوق [illegible] کر سکیں۔ ان کے [illegible]
وقت [illegible] کی تعلیم [illegible]
میں [illegible] کا تذکرہ ہو رہا تھا [illegible]
تھا جو مشرقی بنگال میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کے نام سے [illegible] ترقی [illegible] یہاں ان دونوں [illegible]
کر شاہ اسمٰعیل نے پروا [illegible] بنانے کی [illegible]
اسمٰعیل نے دہلی [illegible] تبلیغ [illegible]
اصلاح کر کے یہاں اولیت حاصل ہے۔ [illegible]

پر وعظ بھی دینا شروع کیا۔ اور ان کی جادو بھری تقریروں سے لوگوں کا رجحان ان کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن ان کی تقریریں اہل سنّت اور شاہ عبدالعزیز کے معتقدات کے خلاف ہوتی تھیں اور وہابیت کا اظہار کرتی تھیں لہذا ان کے اپنے خاندان کے علماء اور مولانا فضل حق خیرآبادی ان کے مقابل میں آگئے جب جامع مسجد میں ان کے مباحثوں و مناظروں کی وجہ سے فتنہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو دہلی کے ریزیڈنٹ چارلس مٹکاف (۱۸۱۱-۱۸۱۹) نے ان کے وعظوں کی ممانعت کی۔ شاہ اسماعیل کی حساس طبیعت نے اس کو اپنی ذلت سمجھا اور اپنے غم و غصہ میں ریزیڈنٹ سے صفائی کرنا ضروری سمجھی۔ اس زمانہ میں انگریز اس بات کی تمنا کرتا تھا کہ علما و شرفا اس سے ملا کریں لہذا شاہ صاحب کی حاضری پر ریزیڈنٹ کو مسرت ہوئی۔ اس نے تپاک سے استقبال کیا۔ ان کا عذر سنا اور دلکش تقریر سے خوش ہو کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے کی اجازت دیدی۔ اسکے بعد شاہ صاحب سے مراسم بھی بڑھ گئے وعظ کی بندش کے زمانے میں شاہ صاحب نے

. . . . . اپنی عربی کتاب "ردالاشراک" لکھی۔ پھر ترمیم و تنسیخ کے ساتھ اُردو کا لباس پہنایا۔ اور اس کا نام "تقویۃ الایمان" رکھا۔ جب اپنے احباب کو اس کا مسودہ دکھایا تو یہ بھی ظاہر فرمادیا کہ اس میں بعض جگہ شرک خفی کو شرک جلی لکھ دیا ہے۔ لہذا لوگ چراغ پا ہونگے۔ مومن خاں صاحب نے دلداری کے طور پر کہا کہ ایسے ہی رہنے دیجئے تصحیح کی ضرورت نہیں ہے۔ "تقویۃ الایمان" میں جہاد کے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا دوسرا حصہ شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد محمد سلطان خاں نے لکھا تھا اسکے مطالب وہی ہیں جو شاہ اسماعیل نے بتلائے تھے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۲۵۲)۔

ریزیڈنٹ نے کسی ملاقات میں یقیناً شاہ عبدالعزیزؒ کے دارالحرب والے فتوے کا مطلب و مقصد سمجھا اور ایسا مفہوم بھی ظاہر کیا ہوگا۔ کہ ہم لوگ کسی کے مذہب میں دراندازنہیں ہوتے اور امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر یہ فتویٰ ہمارے

خلاف کیوں جاری کیا گیا ہے۔ برخلاف ہمارے سکھوں کو دیکھئے کہ مسلمانوں پر کس درجہ مظالم کرتے ہیں اور انہیں معافی دیدی گئی ہے۔ پتہ نہیں کہ شاہ صاحب نے کس منطقی اصول سے ریزیڈنٹ کی تسلی کی۔ مگر سکھوں کے مظالم والی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ دارالحرب والے فتوے کے معنی سمجھے۔ جس میں کلکتہ سے لاہور تک کا ملک دارالحرب قرار دیا ہے اور اس کا اشارہ انگریز اور سکھ دونوں کی طرف ہے پھر شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کے اصول پر پنجاب کا خفیہ دورہ کیا۔ سکھوں کے مظالم بچشم خود دیکھے اور یہ بھی ملاحظہ کیا کہ بے کس مسلمان سکھوں کی عملداری سے بھاگ کر انگریزی عملداری میں آکر پناہ لیتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دشمن کے ساتھ رہتے ہیں نتیجہ یہ نکالا جا سکتا تھا کہ سکھوں سے انگریز اچھے ہیں پھر سکھوں کے خلاف انگریز سے مدد بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے معتقدین پٹھان ساتھ ہو جائیں گے اور ہندوستانی مسلمان جو کارزار میں اور سکھوں کے اصولوں کی وجہ سے رنج میں مبتلا ہیں۔ خود بخود ہم نوا بن جائیں گے۔

دلی واپس آکر تکالیف برداشت کرنے کی عادت ڈالنی شروع کر دی۔ تیرنے لگے۔ ننگے پاؤں تپتی زمین پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پیاس اور بھوک پر غالب آنے کی مشق کی۔ گویا ہر تکلیف کو راحت بنا لیا۔ اور سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس عرصہ میں دلی کا ریزیڈنٹ بدل گیا تھا اور اس کرم فرما کے بجائے ڈیوڈ آکٹرلونی ریزیڈنٹ ہو کر دوبارہ آگیا تھا جس سے شناسائی نہ تھی۔ ان دنوں حالات اپنے استاد مولوی عبدالحی[۱] کو ہمراز بنا کر مشورہ کر سکتے تھے

۱؎ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے شاہ عبدالعزیز کے بھانجے شاگرد اور داماد تھے۔ مدرسہ رحیمیہ میں معلم رہے تھے۔ علمی فضیلت اور علمی متانت کی وجہ سے انہیں تفوق حاصل تھا اور شاہ عبدالعزیز کے معتمد خاص تھے۔

اور چونکہ مولوی صاحب میرٹھ میں انگریز کے دفتر میں ملازمت کرنے کی وجہ سے صاحبان والا شان کے مزاج اور عادات سے بھی واقف تھے ان سے بھی بہترین مدد ملنے کی پوری امید تھی۔ حسب خیالات کی وجہ سے اسکیم زیادہ نہ ہو سکی تو مولوی عبدالحی نے [illegible] شرکت کی [illegible] سید صاحب سے حل کرنا چاہتے [illegible] ملازمت سے [illegible] تبدیل [illegible]۔

"مولوی عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل علیہ [illegible] کی درس تدریس میں مصروف تھے اور [illegible] سے [illegible] معتقد [illegible] تھے" (مقالات سرسید حصہ [illegible] صفحہ ۲۲)

[illegible] مولوی عبدالحی [illegible] جہاد کے [illegible] سید صاحب [illegible] سید صاحب کی [illegible] کے خیال [illegible] ہوں [illegible] امور [illegible] جن کی وجہ سے شاہ محمد اسمٰعیل سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو تیار ہوئے۔ سید صاحب نے [illegible] دو نفل مولوی عبدالحی کو [illegible] متاثر کیا تھا [illegible] شاہ اسمٰعیل کو بھی دو نفل پڑھنے کی فہمائش کی۔ وہ بھی [illegible] عالمانہ [illegible] شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ [illegible] اس کی توجیہ نہ ہو سکی۔ وہ سمجھنے سے [illegible] بغیر عقل کے ایسی ہے۔ جیسے خود زندگی [illegible] بعض [illegible] حل کئے جا سکتے ہیں۔ اس مشاہدہ سے [illegible] سے جہاد کرنے کا دستور غائب ہو گیا۔

"شاہ اسمٰعیل نے سید احمد صاحب کی خدمت میں [illegible] اطاعت قبول کرلی اور سنت نبوی کے مطابق بیعت کی" (حیات طیبہ ص ۳۰)

میرزا حیرت کی اس صداقت کا ثبوت شاہ اسمٰعیل کے طرز عمل سے مل جاتا ہے۔ بہر حال
شاہ صاحب میں سید صاحب کی روحانیت سے زیادہ انکی مقبولیت کے قائل تھے کیونکہ ان کی مقبولیت
سے انہیں کام لینا تھا۔ سید احمد صاحب روحانی آدمی تھے۔ ان کی طرف مخلوق کا
میلان [illegible] تھا۔ مگر انہیں دنیوی سیاسی امور سے [illegible] تعلق نہیں
تھی [illegible] اپنے علم [illegible] روحانیت سے [illegible] بنا دیا کرتے تھے یہی
یہی بات [illegible] سودا سلف [illegible] والوں کی خدمت کی
مدرسہ [illegible] طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہاں کے رہنے والے [illegible] کی خدمت
کی [illegible] سپاہیوں کی [illegible] خدمت کرتے [illegible]
[illegible] خدمت سے انہیں عظمت بھی حاصل ہو گئی تھی [illegible] بزرگوں سے [illegible] وجہ سے
[illegible] متقدمین [illegible] بھی [illegible] اپنی غرض [illegible]
[illegible] باتوں [illegible]
[illegible] شاہ اسمٰعیل [illegible] مذہب کی
[illegible] اسمٰعیل کا مقصود تھا کہ [illegible] مذہبی حکومت
بنا لیں [illegible] ان کی [illegible]
[illegible] ان کا [illegible]
ہو [illegible] ان کی تعلیم [illegible] کی تقلید میں [illegible]
کی حکومت [illegible] انگریزوں سے زیادہ [illegible]
[illegible] باوجود معاہدہ [illegible] شاہ اسمٰعیل کو [illegible] مگر ان کے انتقال کے
[illegible] حقیقت [illegible] کیونکہ [illegible] سنگھ
اور انگریزوں کے درمیان دائمی صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ سید صاحب کی
روحانیت شاہ اسمٰعیل کی خود رائی اور تیزی مزاج کو کیوں نہیں [illegible] دو ہی

جواب ہو سکتے ہیں جن سے انحراف نہیں کیا جا سکتا یا تو سید صاحب کی روحانیت اس درجہ کامل نہیں تھی۔ یا شاہ اسمٰعیل کی استعداد میں نقص تھا۔ دونوں وجہ صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر بظاہر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل بجائے حقیقت پر غور کرنے کے اپنے علم معقول کی بنا پر فروعات میں مبتلا ہو گئے۔ معقولات سے پیدا ہونیوالی ضد اور نخوت نے بے باک بنا کر ادب سے بھی بے نیاز کر دیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے معتقدات سے شاہ اسمٰعیل کے اختراعات نہیں ملتے۔ اگرچہ مصلحتاً شاہ عبدالعزیزؒ سے ہی منسوب کئے جاتے ہیں۔ شاہ اسمٰعیل کے اختراعات ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کسی حسین کی کمر ہو۔۔ وہ کمر کی تعریف میرزا غالب جیسے رند شاعر نے بڑے لطف سے بیان کی ہے۔

ہے کیا۔ جو کس کے باندھئے۔ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اپنی کتاب "تحقیق الحق" میں شاہ محمد سعید مجددی نقشبندی، لمظہری نے مولوی مخصوص اللہ صاحب (فرزند رشید شاہ رفیع الدینؒ) کی روایت لکھی ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نابینائی کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے۔ جب تقویۃ الایمان کی بابت سنا تو فرمایا۔

"اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفہ اثنا عشریہ کی طرح اس کا بھی رد لکھتا۔"
اس کے علاوہ یہ بھی سنا ہے کہ شاہ اسمٰعیل اپنے اختراعات کے متعلق دوسروں کے ذریعہ شاہ عبدالعزیزؒ سے اکثر استفسار کیا کرتے تھے۔ اندھ ہم خیالی نہ دیکھ کر خوب ہو جایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اسی "تحقیق الحق" کے صفحہ ۱۳ پر مندرج ہے کہ مولوی مخصوص اللہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ ــــ "اسمٰعیل کو ہم لوگوں نے سمجھایا، نہیں مانا۔ اور جتنا ہندوستان میں فتنہ پھیلا ہے۔ اسی کی ذات سے پھیلا ہے۔" اور یہ

بھی کہا کہ ـــ حق یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں یہ دو شخص سمٰعیل و اسحٰق ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز و فرق ـ نیتوں ـ حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا"

شاہ اسمٰعیل قرونِ اولیٰ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نقل کرنے کے مدعی ہیں مگر دونوں میں بُعد بعید ہے ۔ اُن حضرات میں بیدار دل تھا ۔ اور اس کی نگرانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے ۔ اور ان صاحبان میں محض دماغ تھا ۔ جس کے زور پر نقل کرنے کا دعویٰ تھا اور سید احمد صاحب جیسی ہدایت کر سکتے تھے ۔ وہ ظاہر ہے ـــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ـــ ان لوگوں کا شعور صحیح نہیں تھا ۔ اپنے عیب کو ہنر سمجھتے تھے ۔ سید احمد صاحب کی ہدایات مضر ہوتی تھیں وہ صاف بول بھی نہیں سکتے تھے ۔ لہٰذا شاہ سمٰعیل ترجمان بن کر نہ ظاہر کیا کرتے تھے ۔ جو خود اُن کا مافی الضمیر اور منشا ہوتا تھا ۔ مثلاً جو معتقدات تقویۃ الایمان اور صراطِ مستقیم کے ذریعہ ظاہر کئے گئے ہیں ۔ وہ کبھی بھی سید صاحب کے نہیں تھے جیسا کہ سید صاحب کے بعض اقوال و افعال سے ظاہر ہوتا ہے جو ان صاحبان نے خود نقل کئے ہیں ۔ وہ نہ اس قدر بلیغ وعظ کہہ سکتے تھے اور نہ اس قدر سیاسی خطوط لکھ سکتے تھے ۔ اور نہ ایسے بیانات دے سکتے تھے جو ان سے منسوب کئے گئے ہیں ۔ ان سب میں علم معقول کی شمولیت اسی کا اظہار کر رہی ہے ۔ یہ تصور و اظہار کہ معتقدین کا کثرت سے ہجوم بیشتر آگیا صحیح نہیں مانا جا سکتا ۔ انگریز کے ستائے ہوئے اس امید پر جمع ہو جاتے تھے کہ ان کے وسیلہ سے گئی ہوئی عزت و ناموس واپس مل جائے گی ۔ ان جمع ہونے والوں میں وہ جوش و یقین نہیں تھا جو قرونِ اولیٰ میں تھا ۔ یہ تو غرض اور طمع کے بندے تھے ۔ ان مُردہ دلوں کو فریب دینے کے لئے سید صاحب کو امام مشہور کر دیا تھا ۔ اور امام ثابت کرنے کے

بے سروپا کرامتیں اور پیشین گوئیاں مشہور کی جاتی تھیں۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن سے روشنی و زندگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور اعلاق بگڑ کر رہ گئے۔ ہمتیں ساقط ہو گئیں اور مضمون سمجھانے والی روح جاتی رہی۔ اور اس مذہبی انقلاب و انحطاط کا خمیازہ آج تک بھگتنا جا رہا ہے۔

شاہ اسمٰعیل نے اپنی اجتہادات میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی معاشرتی اصلاحوں کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کی مذہبی جدتیں ابن تیمیہ ابن عبدالوہاب نجدی اور مشرقی بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی ممنون ہیں۔

(۵) تبلیغی دورے

بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بیعت کے بعد جو دین [illegible] پہنچی
دولت روحانیت سے مالا مال کر کے دولت ولایت اور دولت نیابت انبیاء مرحمت کی گئی
تھی۔ خزانے کی کنجیاں دے دی گئیں۔ بالفرض اس دولت سے رب کریم کے اہل
ہو گئے تھے اور مخلوق کو تبلیغ کرنے کا حق بھی حاصل ہو گیا تھا تو دیکھنا یہ ہے
کہ اس دولت کا استعمال کن طریقوں سے کیا گیا ہے۔ دولت کی مستی بربادی کا باعث
بھی بن جاتی ہے اور دولت کی کثرت غرور و تکبر کی بنا بنتی ہے۔ دراصل کا جا
استعمال دولت کی ترقی کا باعث ہوتا ہے اور سخاوت کی شہرت بھی کر دیتا
ہے شاہ صاحب کو اپنے طالب کی [illegible] حاصل ہوئی اس سے [illegible]
بھائی و فرزند [illegible] آزمائش کی [illegible] ہے [illegible] وصیت
کی گئی ہیں اور متعدد [illegible] اجازت دی گئی تھیں [illegible] سے معلوم
ہوتا ہے کہ سید صاحب نے ان دونوں ہاتھوں سے دولت کو خوب
لٹایا۔ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان کو جب [illegible] خالی ہو کر دنیا سے
[illegible] آٹھ
[illegible] جس کے بعد شاہ صاحب کی کشش نے خاندان کے بہار سے سید
صاحب کو [illegible] پر مجبور کر دیا۔ [illegible] سے سید صاحب کا [illegible]
[illegible] تو اس کا [illegible] سید صاحب کو روکنا نہیں تھا بلکہ رخصت
دینا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کو [illegible] نہیں تھی کہ اس لطائف کے اصل جانے پر
وحشت و اضطراب سے مقابلہ کر لیتا ہے مگر کیفیت بدل جاتی ہے۔ میں

لطیفہ اپنی خاص تاثیر رکھتا ہے۔ جبتک جملہ لطائف میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی کشمکش رہتی ہے اور یہ مصیبت بلائے جان بن جاتی ہے۔ اس کیفیت میں تذبذب رہا کرتا ہے۔ اور یقین کی جھلک بھی نظر نہیں آیا کرتی۔ اس حالت میں بعض اوقات بعض حرکتیں کرامت کی قسم کی بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ قابل اعتماد نہیں ہوتیں لطائف کی تاثیر دل میں اتحاد پیدا ہو جانے پر تذبذب و وحشت کا نام نہیں رہتا سکون و تحمل کے حصول پر یقین جلوہ نما ہوتا ہے اور یہی مدعا و مقصد روحانیت ہے۔ سید صاحب اسی کشمکش وحشت و اضطراب میں مبتلا تھے کہ دہلی آئے۔ یہ اضطرابی کیفیت بڑی کڑی ہوتی ہے۔ اسی منزل میں شیطان و نفس پوری قوت سے حملہ کیا کرتے ہیں۔ اور ان حملوں سے اللہ ہی بچاتا ہے۔ پھر مرشد کامل ایک نگاہ میں ان مخمصوں سے نکال کر کامل بنا دیا کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ولایت اولیاء و ولایت انبیاء اور سند خلافت عطا کر دیتا ہے۔ اس حصہ میں سید صاحب کے اضطراب و وحشت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پورے سات برس وطن اور اہلیہ کی یاد سے بے نیاز اور بے خبر رہے۔

فخریہ اعلان کیا گیا ہے کہ سید صاحب نے جب خط بھیجا ہے تو اسی زمانہ میں شاہ صاحب نے خواب دیکھا تھا کہ انہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے تفصیل یہ ہے کہ:

"جامع مسجد دہلی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ باہر کثیر مجمع مشتاق زیارت ہے۔ سب سے پہلے شاہ صاحب کو سعادت باریابی حاصل ہوئی۔ عصائے مبارک مرحمت فرما کر حکم دیا کہ دروازے پر بیٹھو اور بغیر ہماری اجازت کے کسی کو اندر نہ آنے دو۔"

فن تعبیر میں شاہ صاحب کو خود کمال تھا۔ مگر از راہِ احتیاط یا اظہار شاہ غلام علی

نقشبندی صاحبؒ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے سلسلہ کی اشاعت یا آپ سے خود ہوگی یا آپ کے کسی شاگرد رشید کے ذریعہ ہوگی۔ اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ڈیڑھ سو برس سے یعنی سید حسن رسول نما کے وصال کے بعد سے ہدایت بند ہوگئی تھی (سوانح احمدی)

لوگوں نے یا سوانح نگاروں نے اس تعبیر سے یہ سمجھا کہ سید صاحب کے دہلی آنے پر سلسلہ کا کام وہی چلائیں گے۔ اس خواب کے ایک ہفتہ بعد اوائل ۱۸۱۶ء میں سید صاحب دہلی آئے تھے۔ خواب کی تعبیر یقیناً ایک مژدہ ہے مگر واضح ہے کہ خواب میں عصا شاہ صاحب کو عطا کیا گیا ہے۔ کسی اور یا شاگرد وغیرہ کا برائے نام بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا حیرت ہے کہ یار لوگوں نے شاگرد رشید کا مفہوم کس طرح اضافہ کر دیا۔ سید صاحب کے متعلق اس خواب میں اشارۂ بعید بھی نہیں ہے اور نہ سید صاحب کا اس خواب سے کوئی تعلق ہے۔ مگر شاہ صاحب نے سید صاحب کو جملہ مراحل طے کرا کر اپنی خلافت ضرور دیدی حصول خلافت سے پہلے ان کو مرید کرنے کا نہ حق تھا اور نہ انہوں نے اس سے قبل کسی کو مرید کیا تھا۔ خلافت دینے کے بعد نہ صرف بیعت کرنے کی اجازت دی بلکہ ہمت افزائی کے طور پر شاہ صاحب نے اپنے شاگرد اور اقارب کو بھی خود ان کا مرید کروایا۔ اور اس سے اس قدر شہرت ہوئی کہ دُور دُور سے لوگ مرید ہونے کے لئے آنے لگے۔ اس کے بعد گشت، دَورہ کرنے کا منصوبہ گانٹھا گیا۔ مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دَورے کا تخیل کس کے دماغ کی پیداوار ہے اور اس کا منشا کیا تھا۔ حیات طیبہ اور سوانح احمدی میں مذکور ہے :-

"شاہ صاحب نے حکم دیا کہ آپ خود آس پاس کے شہروں میں وعظ فرمائیں چنانچہ سید صاحب بحکم شیخ روانہ ہوئے"

جناب مہر اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"سید صاحب کا نصب العین جہاد تھا۔ دہلی میں رہ کر جس کا پروگرام سال بھر میں بنایا اور تجربہ کر لینے کے لئے دورے کا منصوبہ کیا تھا۔ جب مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنے لگے تو شاہ صاحب سے دورے کی اجازت لی۔۔۔۔ شاہ صاحب نے خطوط بھی لکھ دیئے کہ یہ باتیں ہیں ان کی توضیح کرنا یہ دورہ شاہ صاحب کے مشورہ سے ہوا تھا۔"

اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ اسمٰعیل و عبدالحی دہلی سے انتظام کرنے کے لئے بطور مقدمۃ الجیش دے دیئے گئے۔ وہ مولوی یوسف پھلتی کو روانہ کیا گیا اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:۔

"لیکن شاہ صاحب کے خطوط سامنے نہ ہونے کی وجہ سے یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کا یہ کہنا آسان ہے کہ مرزا حیرت کی روایت درست ہے یا مہر صاحب کی تحقیق میں جو اختلاف ہے اس کو کیسے ختم کیا جائے۔ کس کو صحیح مانا جائے۔ یہاں عقل و قیاس سے ہی کام لینا پڑے گا۔ جناب مہر صاحب نے قلم میں اپنی تحقیق کا اظہار کرتے ہوئے رعشہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری خود ان کی تکذیب کر رہی ہے دعوت نامے خود بخود بغیر کسی کی تحریک کے نہیں آ سکتے تھے۔ یہ تحریک سید صاحب کی طرف سے کبھی تسلیم نہیں کی جا سکتی بلکہ دعوت ناموں کو شاہ صاحب کی ہی ہدایت تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ تحریک اس لئے کی تھی کہ خود اپنی بیماریوں کی وجہ سے لوگوں کے آنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ دورہ کرنے کی تجویز اس لئے بھی شاہ صاحب نے کی تھی کہ سید صاحب کو مقبولیت حاصل ہو۔ لہٰذا دورے کا تخیل خالص شاہ صاحب کا ہی تھا۔ نہ کہ سید صاحب کا۔ یہ دورہ تبلیغی تھا۔ سید صاحب کے دماغ میں بھی جہاد کا وہم نہیں تھا اور نہ ہو سکتا

ہمارا دو اس لغت سے بھی واقف نہیں تھے۔ البتہ شاہ صاحب کے تحت شعور میں
ان تبلیغوں اور دوروں کا مقصد آخر جہاد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ
ان دوروں کا مفہوم شاہ اسمعیل کے دماغ میں جہاد تھا تو اس کو تسلیم کرنے میں
کسی کو بھی تکلف نہ ہوتا کیونکہ شاہ اسمعیل ریذیڈنٹ کے اشارہ پر سکھوں سے مسلم
کو بھڑکا آئے تھے اور سید صاحب سے دہلی آنے سے قبل جہاد کا تہیہ کر چکے تھے اور کفرانِ
نعمت کی بہترین مثال اس بلاغت و شاعری کے کمال سے ظاہر ہوتی ہے جو
جناب مہر نے یہ لکھ کر ظاہر کی ہے کہ:

"لیکن شاہ صاحب کے خطوط فتنہ سامانی کا ذریعہ تھے نہ تبلیغ و اشاعت کا؟
آپ اگر اس شاعری پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دنوں بھی تبلیغ و اشاعت
کا سہرا مولوی عبدالحی اور شاہ اسمعیل کے سر ہے۔ سید صاحب غریب نہ وعظ فرما
سکتے اور نہ تقریر ہی کر سکتے تھے۔ البتہ اپنے روحانی اثرات سے کام لیتے تھے
بہرحال اس مضمون آرائی کو دیکھ کر سکوت ہی اولیٰ ہے۔

اعزاء و اقربا کو جب سید صاحب کا مرید شاہ صاحب نے بنا دیا تو شاہ
عبدالعزیز صاحب کو متعدد وجوہات سے مسرت بے پایاں ہوتی کہ مولوی
عبدالحی اور شاہ اسمعیل بھی مریدوں کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ سید صاحب
کی روحانیت کو ان جیسے عالم و فاضل دبیروں کی ضرورت تھی۔ اور ان
دونوں حضرات کا علم و فضل سید صاحب کی روحانیت کا محتاج تھا۔ بظاہری
ئے ان ستاروں کا روحانیت کے ستارۂ درخشاں سے رشتہ مربوط ہو جانے پر
یقین تھا کہ بجلی کے منفی و مثبت تاروں کی طرح اتحاد نمودار ہوگا۔ پہلے ہی قدم
پر اتنی روشنی پھیلی کہ شاہ صاحب کے حلقہ اثر میں دلی سے لے کر پٹنہ و کلکتہ تک
کے زمین و آسمان چمک اٹھے۔ مخزنِ برق شاہ عبدالعزیز تھے جو اپنی بیماریوں

کی وجہ سے قطب بنے ہوئے دہلی میں مقیم رہے۔ امید قوی تھی کہ اگر اتحاد ثلثہ میں صحیح توازن رہا تو ولی اللٰہی تحریکِ جہاد اتمام کو پہنچ سکے گی۔ اور شاہ صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ سید صاحب کی روحانیت سے شاہ اسمٰعیل اپنی لغویات سے باز آجائیں گے۔ اسی مفہوم و مقصد کو شاہ عبدالعزیزؒ نے اس طرح ظاہر فرمایا تھا کہ عسکری امور میں جب یہ تینوں ہم خیال ہوں تو ان کی رائے میری رائے سمجھنا۔ جہاد کی ابھی تک کوئی عملی کوشش نہ ہو سکی تھی۔ کیونکہ انقلاب سلطنت اور انگریز کی بے پناہ سختیوں کی وجہ سے مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ ابتری میں مبتلا تھے۔ اور راہِ حق سے دور تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ شاہ غلام علی نقش بندیؒ شاہ فخرؒ اور دیگر اکابر اپنے اپنے طرز میں اصلاح و تنظیم کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے صحیح دماغ اور صحیح قلب رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی جن کو سیاسیات پر عبور ہو اور جو اقتصادیات سے واقف ہوں۔ ایسے کامل و ہمہ داں اشخاص کا فقدان تھا۔ اس اتحاد ثلثہ سے اسی قسم کی امید کے علاوہ یہ بھی توقع تھی کہ ظاہری علم روحانیت سے ہدایت حاصل کر کے کامل بن سکے گا۔ سید صاحب کا اسم گرامی شاہ صاحب کے خلفاء میں سرِ فہرست ہے اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کو بھی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن سید صاحب کے معتقدین بھول کر بھی سید صاحب کی خلافت اور حصول خلافت کا ذکر نہیں کرتے اور بغیر حصولِ خلافت کے سید صاحب کی سیادت کے مدعی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سید صاحب پیدائشی طور پر ولایت انبیاء کے حامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ دبی زبان سے ان کے مامور من اللہ مہدی زمان اور مسیح موعود ہونے کا

ؔ مکتوب نمبر ۲ سوانح احمدی بنام وزیر الدولہ۔ دعویٰ امامت میں نے خود نہیں کیا ہے بلکہ غیب سے ہدایت ہوتی ہے اور اس کا اظہار کرنے میں اب مامور ہوں اس میں کذب کو دخل نہیں ہے۔

بھی اعلان کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر امام تو سمجھتے ہی ہیں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو امام ربانی اور مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔ وہ بھی جبلی طور پر روحانیت رکھتے تھے۔ مگر انہیں حضرت باقی باللہؒ کی بیعت و خلافت کا نہ صرف اقرار ہے۔ بلکہ نازاں بھی ہیں۔ جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے۔ غالباً سید صاحب کے یہ فدائی ابن تیمیہ کی تقلید میں بغیر حصول خلافت کے انہیں ہر قسم کے اوصاف سے متصف کرنا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے سید صاحب کے مختار ہونے کا ادعا ہے۔ اور عدم وجوب تقلید کے قائل ہیں لیکن باایں ہمہ ان کی ظاہری طور پر بیعت کا عجیب انداز سے اقرار ہے مگر کسی طرح بھی یہ ہیچ پوچ جانے والے کو نظر انداز نہیں خیال کیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے یہ ایک قسم کی بغاوت ہے۔ اور اسے منافقت بھی کہا جا سکتا ہے۔ عموماً ذہنیت اس قسم کی مصیبت میں مبتلا ہو کر مغالطے پیدا کیا کرتی ہے۔ یہ نیم دروں و نیم بروں والا معاملہ کسی معیار پہ پورا نہیں اُترتا۔ عربی گھوڑا اور اسپ تازی لاکھ اصیل و ذہین ہو۔ اور قدرت کی طرف سے خاص علمیات بھی سے ہوں۔ مگر وہ بھی تربیت اور کارندے چلنے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن تربیت پا کے بعد بھی اس میں چوگان بازی، پولو کھیلنے اور میخ بازی کی اہلیت و قابلیت نہیں پیدا ہوتی۔ لہٰذا اس کی اسے مزید تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ یہ خلافت کے منکر غالباً کمزور حافظہ رکھتے ہیں۔ ان کے بیانات سے خود ان کی خلافت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ جب شاہ اسمٰعیل سید صاحب کے مرید ہوئے تو شاہ عبدالعزیزؒ نے مصلحتاً ان سے سید صاحب کے کمالات کے متعلق استفسار کیا تھا تاکہ ان کے اعتقاد کا حال معلوم کر سکیں۔ شاہ اسمٰعیل کا جواب سوانح احمدی کے صفحہ بیسویں اور مولانا مہر صاحب کی کتاب سید احمد شہیدؒ کے صفحہ ایک سو اٹھارہ پر محفوظ ہے کہ "سید صاحب پر پروردگار عالم کی نظر رحم ہے اور یہ

آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو علم مرحمت فرمائے ہیں علم ظاہری سے شاہ عبدالقادرؒ فیضیاب ہوئے اور علم باطنی کے حامل سید صاحب ٹھہرے" یہ علم باطن خلیفہ ہی کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ اب رہا دعویٰ مہدیت تو اس پر استاد زمانہ نے پردہ ڈال دیا ہے اور دعویٰ غیبوبیت بھی آج حرف غلط کی طرح غائب ہو گیا ہے۔ امامت کے متعلق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شاہ اسمٰعیل کے علم معقول سے زیر رہی لیکن باوجود ان بدیہی مشاہدات کے ان کے پرستاروں کی آنکھ نہیں کھلتی کہ ان کی اصلی اور واقعی عظمت کو گندگی میں مبتلا نہ کریں۔ سچ کہتے ہیں اندھی تقلید۔ تقلید کے منکر اندھی تقلید کے قائل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ نو ایجاد سلسلہ محمدیہ کا آج کہیں نام و نشان بھی ہے؟

ملفوظات عزیزی میں سید صاحب کا پانچ جگہ ذکر ہے۔ اس سے ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ ترشح نہیں ہوتا کہ شاہ صاحب نے ان پر کڑی نگرانی رکھی، اور سید صاحب نے جو کچھ بھی کیا وہ ان کے احکامات کی تعمیل تھی۔ سید صاحب اور شاہ صاحب کے معتقدات و اعمال میں تطبیق کی جائے، تو بین اختلاف نمودار ہوگا۔ کم از کم سید صاحب مد نمبر ۵ کی نصیحت ہی کو سمجھئے بہرحال عجیب معاملہ ہے۔

کسے نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

۱۔ شاہ صاحب سید صاحب کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ خاندان مجددی میں۔ "نسبت[1] آدمی بسوئے خدا کے نام سے جو نسبت" ہے وہ ان کو کرامت ہوتی ہے۔ دہلی میں بہت سے آدمی ان سے منتفع ہوتے تھے۔

۲۔ سید صاحب نے شاہ صاحب کے ایک مرید کے متعلق عرض کیا کہ قانیت

---

[1] یہ الفاظ یا تحریف شدہ ہیں یا سہو کاتب ہیں۔

اور عشق کی وجہ سے اس مرید کو حضرت سے جو خصوصیت ہے اسکی وجہ سے مجھ کو بھی اس سے نہایت درجہ محبت ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ اس بندے کو خالص محبت ہے۔ خدا جزائے خیر دے۔ یہ امر اختیاری نہیں ہے جیسا کہ لکھا گیا ہے ؎

یا دل بکہ باید داد یا دل زکہ باید برد
دل دادن و دل بردن ایں امر خداداد است

۳۔ فرمایا سید احمد بریلوی ذکی القلب ہیں۔ ذکی اسے کہتے ہیں جو اعتبار نکتہ یعنی طبیعت، عقل و قلب کے ذریعہ صرف کہنے سے کل حقیقت سمجھ لے اور تشریح و تفصیل کا محتاج نہ ہو۔

۴۔ سید صاحب نے سوال کیا کہ جاڑے کے دنوں میں کنوئیں کا پانی کیوں گرم ہوتا ہے (علمی توجیہہ کر کے مطمئن کر دیا)

۵۔ سید احمد بریلوی سے فرمایا کہ دنیا بھیجے کی طلب اگر منظور اللہ کیلئے اس سے کچھ حاصل ہو جائے تو بہتر ہے (اور ان کی سید صاحب پروا نہیں کی)

مختلف تذکروں میں سوانح نویسوں نے صحیح یا غلط جو کچھ بھی لکھا ہے وہ پیش نظر ہے۔ اسی پر بحث کی گئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنی جماعت کو یہ حکم دیا تھا کہ عسکری امور کے جس معاملہ میں سید احمد، مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل تینوں جمع ہو جائیں اسے عبدالعزیز کا حکم سمجھنا چاہئے اور تنظیمی امور کے لئے شاہ اسحٰق کو امیر اور مولانا یعقوب کو ان کا مشیر بنایا تھا۔ (منقول از عبیداللہ سندھی) بعض سوانح نگار شاہ محمد اسحٰق کی اہمیت کو گھٹا کر شاہ محمد اسحٰق کو سید صاحب کے لئے چندہ جمع کرنے کا منصب عطا کرتے ہیں۔ اس کو تنگ نظری یا حسد ہی کہا جا سکتا ہے۔

قصہ مختصر سوائے جناب مہر کے ہر تذکرہ نویس کو اقرار ہے کہ شاہ صاحب نے

---

(۱) ممکن ہے کہ شاہ [illegible] شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی طرف ہو جن سے اس کا مقصد [illegible]

ہدایت فرمائی تھی کہ — "بطور خود آس پاس کے شہروں کا دورہ کریں۔" چنانچہ ان کے ہی حکم کے مطابق دورہ کیا گیا۔ دوران ہی کی بنائی ہوئی تدبیر کے مطابق خالص طور پر بدعنوان اور تبلیغ کا دورہ کرنے کے لئے (سوانح احمدی وحیات طیبہ) مختلف مقامات پر اعلان واشتہار دینے کی غرض سے اور چندہ جمع کرنے کے لئے سفیر بھیجے گئے چنانچہ منجملہ دیگر حضرات کے شاہ اسمعیل مولانا عبدالحی اور مولوی محمد یوسف کو انہوں نے ہی سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنا شروع ہوئے، پھر شاہ صاحب نے ہر جگہ تعارف کے خط لکھے کہ "یہ ہمارے ہی آدمی ہیں" (سوانح احمدی وحیات طیبہ) ان سفارشی خطوں کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرحلہ جلد آسان ہو جائے۔ سفارش اہل کی ہی کی جاتی ہے۔ نااہل کی نہیں کی جاتی سفارش و تعارف خطوں کو بیاں کے اہم ضروری سمجھے جاتے ہیں معلوم نہیں۔ سید صاحب کے تذکرہ نویس کتنے جیں بہ جبیں ہونگے۔ اگر سفارش و تعارف کے ساتھ وسیلہ کا بھی اضافہ کر دیا ہے کیونکہ یہ سب الفاظ مترادف ہیں اور یہ بھی مُسلم ہے کہ خاندان ولی اللّٰہی کی نسبت اور شاہ عبدالعزیز کی ہر دلعزیزی اور تعلیم بھی سید صاحب کی شہرت کا سنگ بنیاد بنی ورنہ بیلے بود در سبستان۔

ابھی دوآبہ کے دورے کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ سید صاحب کی بازیافتگی کی خبر اتنے زمانہ کے بعد ان کے بڑے بھائی گھر ہو تی اور سید محمد اسحٰق صاحب ان کو وطن لے جانے کے لئے بے تابانہ طور پر دہلی آ گئے لیکن سید صاحب کی مشغولیتوں اور

لہ کسی نوعیت سے شاہ عبدالعزیز کی تحریر و تقریر میں اس قسم کی روایتوں کی سند نہیں ملتی اسی واسطے ان احکامات سے متعلق تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف بھی ہے بہتر ہوتا کہ شاہ عبدالعزیز کو معاف کر دیا جاتا اور ان کو شامل نہ کیا جاتا۔

ٹہ انہوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا تھا۔

شان و شوکت کو دیکھ کر انہوں نے مناسب سمجھا کہ ان امور سے فارغ ہو کر سید صاحب وطن آئیں اور اُلٹے قدم واپس چلے گئے۔ وطن والوں کو نخرۂ مسرت کے ساتھ سید صاحب کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور وہ سب ذوق و شوق کے ساتھ سید صاحب کی مراجعت کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔ سید صاحب کا یہ دورۂ تبلیغ جس میں جہاد کا کوئی ذکر نہ تھا، اپنی قسم کا عجیب و غریب دورہ تھا۔ اس کی جدت لذید تھی۔ اور کامیابی قدموں سے لگی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کا دوآبہ میں بے حد اثر تھا۔ ان کے مریدوں، شاگردوں اور رشتہ داروں نے ہی اول اول ان کا استقبال کیا۔ بیس تیس رفیق جلو میں ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کی تعداد سو سوا سو تک پہنچ گئی تھی۔ اتنی بڑی جماعت کا گھر گھر جانا بذاتِ خود مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ ہر جگہ وعظ فرماتے جاتے تھے۔ مذہبی اصول سمجھاتے جاتے تھے اور نذرانے لئے جاتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی سید صاحب کی پالکی کے ڈنڈے تھام کر ملس پیدل چلا کرتے تھے۔ یہ گشت پھلت، مظفر نگر، لہاری، سہارنپور، دیوبند اور نانوتہ وغیرہ میں ہوا تھا۔ اس کی مدت چھ ماہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی مقبولیت یہاں حاصل ہوئی اتنی کسی اور جگہ نہیں۔ عام خیال تھا کہ تاریکی چھٹ جائے گی، الجھن دُور ہو جائیں گے۔ نحوست مٹ جائے گی۔ ادبار جاتا رہے گا۔ چاند نکل آئیگا۔

رامپور کے دورے میں ایک حکیم صاحب نے خود سید صاحبؒ ان کے "طریقہ محمدیہؒ" کے متعلق استفسار کیا تھا اور سید صاحب نے خود اپنی زبان مبارک سے بالتفصیل اور طول و طویل وعظ کی صورت میں تشریح فرمائی تھی۔ جس کا لب و لباب یہ ہے کہ پہلے جملہ سلاسلِ صوفیہ میں بیعت لینے کے بعد اپنے "طریقہ محمدیہؒ" میں بیعت اسلئے لیتا ہوں کہ دوسرے طریقوں میں

رسولؐ کا تعلق بطور باطن کے ہے اور "طریقۂ محمدیہ" میں بطور ظاہر کے اور اس کے فضائل بتائے ہیں۔ گویا سید صاحب رسول سے ظاہری تعلق رکھنے کو باطنی تعلق پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور لازمی سمجھتے ہیں۔ یہ وعظ اور تشریح سن کر حکیم صاحب مطمئن ہو گئے۔ شاید حکیم صاحب محض قارورہ دیکھ کر جو ظاہری شئے ہے علاج کیا کرتے تھے۔ اور نبض سے انہیں تشخیص کرنا نہیں آتی تھی کیونکہ یہ باطنی چیز ہے۔ اسی وجہ سے مطمئن ہو گئے ورنہ وہ یقیناً ایسی مبہم بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتے آخر انہوں نے سید صاحب سے کیوں نہیں دریافت کیا کہ آپ کی پوری کائنات علم لدنی پر ہے جو مخفی خوبی ہے اور ظاہری علم یعنی شریعت سے متعلق آپ کو پوری دستگاہ نہیں ہے اسلئے اپنی خصوصیات کے مطابق آپ کو رسول سے باطنی تعلق و نسبت رکھنے کی تلقین کرنا چاہیئے تھی۔ مگر جو وعظ ارشاد فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ہم نے بات الٹی پایا ،الٹا۔ ممکن ہے کہ اپنے آپ کو ملامتیہ ظاہر کرنے کے لئے ایسا وعظ فرمایا ہو یا پھر اسکی وجہ ظاہری یہ ہو کہ سب سے زیادہ وہ انگریزوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور انگریز اسلام کو محمڈزم کہا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خوشی کی خاطر انہوں نے ظاہر پرستی اختیار کی اور اپنے طریقہ کا نام بہ تقلید انگریز "طریقۂ محمدیہ" رکھ لیا، ورا گر رامپوری حکیم صاحب کو کچھ بھی شائبہ علم شریعت و طریقت ہوتا تو وہ بآسانی تردید کر سکتے تھے کہ شریعت سیڑھی ہے اور اس کے ذریعہ چھت پر چڑھا جاتا ہے اور اس چھت کا نام طریقت ہے اور یہی مقصد ہے۔ [illegible] شریعت کی پیروی نہ ہو [illegible] ہو [illegible] تو نتیجہ ظاہر ہے کہ [illegible] بگڑیگی۔ نماز پڑھنی ضروری ہے۔ اس کی بہت تاکید ہے۔ مگر ظاہری رکوع و سجود کا نام نماز نہیں۔ صاف بتایا گیا ہے کہ نماز بغیر حضور قلب کے قیامت میں منہ پر ماری جائیگی۔ اور حضور قلب باطنی شئے ہے۔ جو رکوع و سجود کے ذریعہ

قلب و دماغ کو متاثر کر کے حاصل کیا جاتا ہے ۔ لہٰذا باطنی نسبت کو مقدم کر کے ظاہری نسبت کو مؤخر کر دینا ، اور باطنی نسبت کو ظاہری نسبت کے مقابل میں کم درجہ سمجھنا مومن کا کام نہیں ہے ۔ بغیر انجام کا خیال کئے ہوئے محض آغاز پر قناعت کر لینا صحیح نہیں ۔ بدرجہ کے رسیا ہونے کی وجہ ہے کہ بدنام بھی گر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا یہ شاہ صاحب ہی کہہ سکتے تھے ، سید صاحب سے ممکن نہ تھا ۔ یہ آیا مہ ہے سید صاحب سے اُن کی منسوب

قیام سہارنپور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو مختلف نوعیت سے اہمیت رکھتا ہے ۔ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ہو ا ۔ مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ ..... " سہارنپور میں ایک مسجد بونبی والی کے نام سے مشہور تھی ۔ سید صاحب اس مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے ۔ دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں ۔ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں ۔ سید صاحب مسجد میں جا کر ان سے ملے ۔ اور اس کے بعد عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر یہاں مقصود ہے ۔ کہتے ہیں کہ بونبی والی مسجد میں جو صاحب رہتے تھے ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولایتی تھا ..... امروہہ پہنچ کر حضرت شاہ عبدالباری سے مرید ہوئے ۔ اور ان کی تعلیم و تربیت سے مستفید ہو رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ اور خلافت کی سند نہ مل سکی ۔ سہارنپور میں آ کر بونبی والی مسجد میں قیام فرما لیا تھا کہ ایک دولت بیدار خود ان کے سرہانے آ گئی ، یعنی سید احمد شہید ان کے پاس ملنے آ گئے ۔ ملنے کے ساتھ خلوت ہو گئی ۔ کچھ ایسے قضیئے درمیان میں پیش آئے ۔ آخری نتیجہ یہ تھا کہ دو پیر دل سے مرید اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد سید شہید کے دست حق پرست پر شاہ عبدالرحیم نے بیعت فرمائی ۔ اور اجازت بھی ان کو سید صاحب سے حاصل ہوئی ۔ اور ان ثلاثہ میں حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف ہو کر کیفیات و نسبت کا تبادلہ نے

مجھے. صلـ۱۲۵ . اور میر شاہ خان کا بیان مولانا قاسم نانوتوی کی زبانی یہ ہے کہ:۔
"آخر میں شاہ عبدالرحیم پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ ہو گیا تھا۔"۱۲۶
مشائخ دیوبند کے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرشد برحق میاںجی نور محمد جھنجھانویؒ کے پیر یہی حضرت عبدالرحیم ولایتی ہیں۔ جن پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ بقول نانوتوی ہو گیا تھا۔ ...... ایک طرف .... سید شہید کی خدمت میں انہوں نے عرض کیا کہ میں ذکر و شغل حضرات قادریہ و چشتیہ کر چکا ہوں۔ (ارواح ثلاثہ) اور دوسری طرف سید شہید کی نسبت غالب آ جانے کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ سید شہید سے آپ کو نئی چیز کیا ملی۔ تو فرمایا سید صاحب کی برکت سے نماز پڑھنا آ گئی اور روزہ رکھنا آ گیا (وصـ۱۲۷) یعنی باطن کے ساتھ ظاہر کی تکمیل ہو گئی۔

"سوانح احمدی" میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ سید شہید کے خلفائے اعظم میں حاجی عبدالرحیم کا نام لکھ دیا ہے۔ "سیرت سید احمد شہید" میں حاجی عبدالرحیم اپنی خلافت سے دستبردار ہونے کا اقرار کرتے ہیں پہلی نسبت کی کمزوریاں بتاتے ہیں اور نئی نسبت و خلافت کا اقرار کرتے ہیں۔ یعنی وہ بقول خود سید صاحب کی خلافت پر نازاں ہیں۔ گویا صابری نسبت کو انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ جناب مہر صاحب نے بھی اسی حقیقت کے متعلق نہایت لطف کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"سہارنپور میں سید صاحب مسجد بوبنی میں ٹھہرے تھے۔ وہیں حاجی عبدالرحیم ولایتی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے پیر مانے جاتے تھے۔ سید صاحب کو دیکھا تو خود بیعت کی۔ اور مریدوں کو بھی بیعت کا حکم دیا۔ فرمایا کرتے تھے ہمیں نہ نماز پڑھنی آتی تھی نہ روزہ رکھنا آتا تھا۔ سید صاحب کی برکت سے

ہم دونوں کام سیکھ گئے۔"

حقیقت کچھ ہی ہو مگر ان بیانات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو صابری اپنا سلسلہ مخدوم صاحب سے ملاتے ہیں وہ غلط ہے اور ان کو ان شہادتوں کی بنا پر اپنے آپ کو سید احمدی کہنا چاہیئے۔ روایتوں میں عبدالرحیم کا نام ہے مگر اس نام کے اس زمانہ میں دو شخص تھے۔ ایک عبدالرحیم کاندھلوی اور دوسرے عبدالرحیم ولایتی۔ ان روایتوں میں عبدالرحیم کی شخصیت کا تعین نہ ہونا امیر حمزہ کی داستان بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب سے مغلوب ہو جانے والے عبدالرحیم کاندھلوی ہوں۔ واللہ اعلم۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ عبدالرحیم ولایتی جہاد میں شریک تھے اور انہیں شہادت نصیب ہوئی۔

جناب مہر صاحب کی تحقیق اینق ہے کہ دورہ ختم کر کے جب دہلی واپس آئے تو اپنے بھائی سید محمد اسحٰق کے انتقال کی خبر سنی۔ اسلئے وطن جانے نے مجبور ہو گئے بقیہ تذکرے منفق البیان ہیں کہ بڑے بھائی کے انتقال کی خبر سہارنپور کے قصبہ منہاراں میں سنی تھی اور وہیں سے ساٹھ ستر رفیقوں کو ساتھ لے کر سیدھے وطن چلے گئے تھے۔ اثنائے راہ میں مختلف مقامات گڑھ مکتیسر، امروہہ، مرادآباد میں تبلیغ کرتے ہوئے ریاست رامپور پہنچے۔ وہاں کچھ دن قیام کیا۔ یہاں ایک افغانی نے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی دردانگیز طریقہ سے داستان سنائی۔ اس ریاست پر انگریزوں کا اثر ہو چکا تھا۔ بھائی کے انتقال کا صدمہ تو تھا ہی۔ مگر اس غیر محض افغانی کا بیان سن کر دل دہل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ منصف مزاج تھا۔ مگر سکھ سردار اپنی جہالت کی وجہ سے مسلم آزاری پر اتر آئے تھے۔ پھر بانس بریلی وغیرہ میں تنظیم و تبلیغ کے جلسہ کرتے ہوئے شعبان ۱۲۳۴ھ کی چاند رات کو مطابق ۲۳ جون ۱۸۱۹ء دس سال کی فراری وغیر حاضری کے بعد وطن مالوف رائے بریلی میں تشریف فرما ہوئے

یہاں چھبیس ماہ قیام کیا یعنی ۲۳ اگست ۱۸۲۱ء تک تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ طعام و قیام کا انتظام پوری جماعت کا بفضلہٖ بخیر و خوبی ہوا۔ اہل وطن کے اختلافات دُور کئے۔ سب میں صلح کروائی۔ اعتقاد کی درستی میں خاص سعی کی۔ شرک کے معنی صحیح طور پر سمجھائے۔ جن سے وہابیوں کے شرک کی تائید منظور نہیں تھی۔ بدعتوں کی تردید کی اور معاشرہ کی اصلاح فرمائی۔ تعزیوں کے جلوس کے متعلق قریب کے قصبہ نصیر آباد میں شیعہ سنی اختلاف کو دور کروانا چاہا۔ صلح نہ ہو سکی مگر جلوس نہیں نکلا۔ مجتہد صاحب نے لکھنؤ جا کر حکومت سے شکایت کی۔ اس پر سید صاحب کی طلبی ہوئی۔ مجرم بن کر گئے تھے۔ مگر لکھنؤ سے فاتح بن کر لوٹے۔ اس مرتبہ بھی یہاں کی کورنش اور تسلیمات پر معترض نہیں ہوئے۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ لکھنؤ والوں کے تکلفات اور نمائشی اصولوں سے سید صاحب کی سادگی مات کھا گئی۔ جب لکھنؤ والوں کی تہذیب کو گوارا کر لیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قبولیت عامہ نہ ہوتی لکھنؤ سے واپس آ کر جب دیکھا کہ نکاح بیوگاں کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو نمونہ اور مثال قائم کرنے کے لئے اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے خود نکاح کر لیا۔ پتہ نہیں کہ زیور ادنے موجود تھیں یا نہیں۔ پھر تو یہ ہندوانہ رسم غائب ہو گئی۔ اس سلسلہ میں تذکرۃ الرشید کی روایت دلچسپ ہے یعنی بعد نکاح ثانی سید صاحب کی نماز فجر قضا ہونے لگی اور جماعت چھوٹ گئی۔ آخر کار مولانا عبدالحی نے فرمایا کہ اب عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت منائی جائے گی۔ سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ پھر نماز فجر با جماعت ہونے لگی۔" "سوانح احمدی" اور "سیرت سید احمد شہید" میں یہ روایت ہے کہ سید صاحب غوطہ مار کر دو رکعت نماز پانی کے اندر پڑھ لیتے تھے۔ اسی زمانہ میں گویا ۱۸۲۰ء میں صراط مستقیم منصہ وجود میں آئی۔ کہتے ہیں کہ

---

[1] صراط مستقیم ۱۸۲۲ء میں کلکتہ میں چھاپی گئی تھی جب کہ سید صاحب حج کو گئے ہیں ۱۸۱۸ء والی روایت غلط ہے۔

سید صاحب اپنا مفہوم بتا دیتے تھے اور شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی اپنے اپنے مطابق پورا مضمون لکھ دیتے تھے۔ درحقیقت صراط مستقیم کے مصنف شاہ اسمٰعیل ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقویۃ الایمان منسوخ ہو گئی۔

اب یہاں کی بستی میں مختلف مقامات سے آکر جمع ہونے والے معتقدین کی تعداد چار سو کے قریب پہنچ گئی تھی۔ رامپور میں افغانی کا بیان سن کر قلب کے اندر پھانس چبھ گئی تھی سال دو سال میں اپنی مقبولیت دیکھ کر طے کیا گیا کہ کار تبلیغ عام کو پہنچ گیا اب قلوب کو جہاد کی طرف لگانا چاہیئے۔ شاہ عبدالعزیز کو اس ارادہ کی خبر نہیں کی گئی، اسلئے کہ ان کا فتویٰ موجود تھا۔ اور ان کا منشا بھی قیاس کر لیا گیا تھا بہ یک کرشمہ دو کار کے اصول پر اشاعت دین کے ساتھ جہاد کی بھی تلقین کی جانے لگی۔ جب جہاد کا ارادہ طے ہو گیا تو کچھ دن بعد اپنے طریقہ محمدی کے اصول پر اعلان کیا گیا کہ ورد وظائف ترک کئے جائیں، عزلت نشینی کا حاصل کچھ نہیں۔ فنون جنگ پر طبع آزمائی کی جائے۔ روحانیت کو جنگ کی مشقوں سے زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے کس کی مجال تھی کہ کوئی دم مار سکتا۔ مگر ہر شخص دم بخود تھا۔ مولانا مہر کی روایت کے مطابق عبدالرحیم کاندھلوی کی وساطت سے لوگوں نے اس شدود کے معنی سمجھنے چاہے۔ اور یہ جواب عنایت فرما کر کہ جہاد کا درجہ عبادت سے افضل ہے سب کو مطمئن کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف سیرت سید احمد شہید کا یہ بیان ہے کہ مولوی محمد یوسف کے استفسار پر یہی توضیح بتا کر کہا تھا کہ اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ شاہ عبدالرحیم ولایتی سے اپنا اطمینان کر لے۔ یہ عبدالرحیم ولایتی شاہ عبدالباری امروہوی کے سلسلہ صابریہ میں خلیفہ تھے۔ مگر وہ سلسلہ صابریہ کو ترک کر کے حسب روایت "سوانح قاسمی" و "تذکرۃ الرشید" سید صاحب کے خلیفہ بن گئے تھے۔ اس کی تصدیق اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے سید صاحب

کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے دیا تھا۔ بہر حال جب ان ولایتی صاحب سے لوگوں نے سید صاحب کے اس نئے حکم کا مطلب سمجھنا چاہا تو انہوں نے سید صاحب سے اپنی بیعت کا ماجرا بتایا۔ پھر سمجھایا کہ گھاس کھودنے۔ لکڑی کاٹنے۔ مٹی ڈھونے۔ دیوار بنانے اور جسمانی محنت کرنے سے میری مادیت زائل ہو گئی۔ اور روحانیت بڑھ گئی۔ یہ بھی بتایا کہ اگر میں اپنی پرانی حالت میں مرجاتا تو میری نجات نہیں ہوتی۔ مگر مہر صاحب نے اس سے بہتر توجیہہ لکھی ہے۔ گویا تنبیہ کے بعد یہ نسخہ تجویز کیا تھا۔ بہر حال اس نئے حکم کے بعد بجائے تسبیح کے یہاں ہر ایک ہاتھ میں تبر و تفنگ نظر آنے لگے۔ مصلے پر بیٹھنے کے بجائے ہر شخص کبڈی کے کھیل میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح روحانیت میں بے حد و بے قیاس ترقی ہوئی۔ جب جسمانی مشقت سے روحانی معراج حاصل ہو گئی تو ایک نیا مکان اور دو نئی مسجدیں تعمیر کروائی گئیں اب جو دورہ کیا جاتا تھا۔ تو ایک سو ستر غازی ساتھ میں ہوتے تھے۔ چنانچہ فوجی قواعد کے ساتھ سلون کانپور۔ الہ آباد۔ بنارس اور سلطانپور وغیرہ کا دورہ کیا گیا۔

بنارس میں آگسٹس بروک کی بقول جناب مہر صاحب۔ مسلمان بیوی حیات النساء نے بیعت کی۔ مگر اس کی بیعت کا واقعہ سفر حج کا ہے۔ بہر حال بنارس میں اس نے سات ہزار روپیہ کی رقم نذر کی تھی جس کو سید صاحب نے حرام ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کے مختار عام نے اس رقم کو تجارت میں لگایا۔ اور منافع کثیر پیدا کیا جو سید صاحب کی روانگی حج کے وقت موقعہ پر نذر کیا گیا۔ اور انہوں نے قبول فرمالیا۔ شاید حرام اس رقم کو اسلئے سمجھا تھا کہ حیات النساء منکوحہ نہیں۔ بلکہ کسبی تھی اور اس انگریز کے یہاں مدخولہ کی طرح رہتی تھی۔ حرام کمائی کا منافع جائز ہو جانا ایک نیا مسئلہ ہے۔ مگر جناب مہر صاحب کا خیال ہے کہ :-

"جہاد کے غلبہ و جوش کی داستان سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے"

ورنہ جہاد تو پہلے ہی سے ان کی سرشت میں داخل تھا۔

لیکن یہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بقول "حیاتِ طیبہ" شاہ اسمٰعیل سکھوں سے جہاد کا تہیہ سید صاحب کے دہلی آنے سے پیشتر اپنے قلب میں رکھتے تھے، اس لئے جہاد صاحب کا خیال خود ان کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اور یہ جہاد کسی کے بھی تخیل کا کرشمہ ہو، مگر عقل سلیم ہنستی ہے۔ بغیر سامانِ جہاد مٹھی بھر آدمیوں کے سہارے انگریزوں یا سکھوں سے جہاد کرنا خود مضحکہ خیز ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بر بنائے قوت روحانی یہ ارادہ کیا تھا تو اس کا ثبوت دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے۔

"عمل جہاد کو انجام دینے کے لئے اس کے اسباب دلوازم کا مہیا کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔" (ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۹۱) یہ صحیح ہے کہ جنگیں بس بے سامان ہوائی نہیں، بلکہ ہتھیاروں کے قبضہ میں تھیں اور توڑتے تھے اور اگر یہی بنائے جہاد ہے تو لوٹ ایسا کھیل ہے۔ جو ایسے کھیل نہیں کھیلا کرتا اور اس کو مجاہد غازی نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۰۰ء میں رنجیت سنگھ نے سکھوں کی حکومت قائم کی تھی اس کے بعد مسلمانوں پر ستم ڈھلنے گئے ہیں۔ دہلی کے ریزیڈنٹ سے ملاقات میں اشارہ پاکر شاہ اسمٰعیل نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد جہاد کے اجرا کا تصور جمایا تھا جس زمانہ میں سید صاحب دہلی آئے تھے وہ جہاد تو جہاد سکھوں کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ اب جب رامپور میں افغانی نے سکھوں کا نام سنایا اور ان کے مظالم بتائے تو سید صاحب متاثر ہوئے اور شاہ اسمٰعیل کو اپنا بھولا ہوا خواب یاد آگیا۔ پھر تو شاہ اسمٰعیل سید صاحب کو جہاد کی ترغیب دینے لگے۔ برابر تقاضے کرتے رہے اور مختلف پہلو دکھلاتے ہوئے انہیں راہ پر لگا لائے۔ ماحصل یہ ہے کہ اصلی تخیل جہاد شاہ اسمٰعیل کا تھا۔ چونکہ سید صاحب کو سردار بنایا تھا۔ اسلئے جہاد کا سہرا ان کے ہی سر باندھ دیا گیا۔ گویا شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی سید برادرز

کی طرح یہاں ولی گر بن گئے ۔

جہاد کی تبلیغ کے ان دوروں کے بعد حکومت اودھ کے نواب معتمد الدولہ نے کسی نامعلوم وجہ سے سید صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ سید صاحب مع خدم وحشم دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔ اس مرتبہ علمائے لکھنؤ اور شاہ اسمٰعیل سے حج کے ساقط ہونے پر بحث ہوئی۔ اور فریقین نے راہ کے خطروں کی وجہ سے حج کے ترک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فتوے لکھے اور ان فتووں کو منشی خیرالدین لکھنوی نے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں فیصلے کے لئے بھیج دیا۔ ان کا فیصلہ شاہ اسمٰعیل کے حق میں تھا۔ ان بحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معشوق تھا اس پردۂ زنگاری میں۔ اور مسئلہ حج پر اس خاص وقت میں بحث کروانے کا کچھ منشا بھی تھا۔ اس مناظرے اور فتووں کی وجہ سے سید صاحب نے پلٹا کھایا کہ خطرات راہ کی وجہ سے حج کے ترک کرنے کا جو رواج پیدا ہو رہا ہے اسے ختم کر دینا چاہیئے۔ لہٰذا قصدِ جہاد کو منسوخ کر کے حج کرنے کا تصور جمایا۔ شاید اس زمانے میں سکھوں اور انگریزوں میں مزید راہ و رسم پیدا ہونے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ ریاست رامپور میں افغانی کی داستان سُن کر جہاد کا تصوّر بندھا تھا۔ اب ریاست اودھ میں حج کا تصور بندھا اور سمجھایا گیا کہ محض ہندوستانی مسلمانوں سے سکھ مار کھانے والے نہیں ہیں۔ اسلئے بیت اللہ جا کر سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے عالم اسلامی کی حمایت حاصل کر لینا چاہیئے۔

اس سفر لکھنؤ میں ایک اور نعمت ہاتھ لگی یعنی مولوی اشرف علی لکھنوی کے شاگرد مولانا ولایت علی عظیم آبادی بڑے دم خم سے مباحثہ کرنے آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رام ہو کر نہ صرف حلقہ بگوش ہوئے۔ بلکہ سید صاحب کے ساتھ بھی ہو لئے

لے کاش اس قسم کے شرعی مسائل سے خود واقف ہوتے اور فتنہ کو سمجھتے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد کالے پانی میں سید صاحب کے دوبارہ تشریف لانے کا انتظار کرتے ہوئے راہی ملک بقا ہو گئے۔

خدا جانے کونسی بات صحیح ہے۔ بہر حال بنارس یا لکھنو کے سفر سے واپسی میں سید صاحب نے معتقدین کو نہایت سادگی سے مطلع کیا "اب ہم حج کو چلیں گے" تبدیلی ارادہ کا باعث اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا تھی۔ الہام تھا، یا کسی دشمن کا سکھانا تھا۔ بہر حال پردۂ زنگاری کی بات ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے متعلق قیاس کر کے کیوں گنہگار بنا جائے مولوی مرتضیٰ علی صاحب کا بیان ہے کہ:-

شاہ عبدالعزیز کہا کرتے تھے کہ جب سید صاحب حج سے واپس آئیں گے تو میں سید صاحب سے بیعت کروں گا لیکن جب وہ واپس آئے تو شاہ صاحب کا وصال ہو چکا تھا۔ اور یہ شرف ان کو نصیب نہیں ہوا (سوانح احمدی) مگر تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ صاحب کا وصال ان کے واپس آنے کے بعد ہوا ہے غالباً حافظہ ضعیف ہو جانے کی وجہ سے مرتضیٰ صاحب کو سہو ہو گیا۔

(۶)

حج

جہاد کی راہ میں قدم اٹھتے ہی ڈالا تھا کہ حج کا اعلان فرما دیا گیا۔ جہاد کے التواء کے اسباب جو بتائے گئے ہیں۔ ان کا ملخص یہ ہے:۔

سوانح احمدی۔ اعلان بنارس سے واپس آکر کیا تھا۔ صاحب "مخزن احمدی" کے خود دست لکھا ہے کہ بچپن سے طبیعت میں شوق اعلائے کلمۃ اللہ و انطفائے نائرہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا۔ اس واسطے ہر گھڑی جہاد و قتال کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی گو کافر تھی۔ مگر اس کی مسلمان رعایات آزادی اور سرکار انگریزی کی بے رو ریائی اور بوجہ موجودگی ان حالات ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کے مانع تھے۔ اس واسطے سکھوں کے مظالم کی وجہ سے سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا۔ مگر جہاد کا کام آسان نہ تھا۔ آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے فرض حج ادا کر لیں۔ اور بعد ادائے اس فرض کے سکھوں سے جہاد شروع کر دیں:

سیرت سید احمد شہید۔ محبت و شوق و جذب الٰہی کا......
مگر صاحب مخزن کا بیان بایں الفاظ "سوانح احمدی" میں ہے کہ چونکہ انگریز عدل گستری کی وجہ سے ان سے جہاد کرنا جائز نہیں تھا۔ لہٰذا سکھوں سے جو دین و مانع مذہب تھے۔ جہاد کرنے کی ٹھہری اور طے کیا کہ حج پہلے کیا جائے اور سب مریدوں کو اس کی اطلاع دی گئی۔ مخزن احمدی کی معلومات یقیناً صحیح ہو سکتی ہیں کیونکہ مصنف سید صاحب کے بڑے بھانجے تھے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے

گئے..... شدید تقاضا تھا کہ حج کو چلئے..... سید صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے مردہ سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا. فرض کو کس طرح نہ کرتے حج عرصہ سے..... متروک ہو گیا تھا...... حج جہاد کا مقدمہ بھی تھا. سید صاحبؒ نے حج کی تیاری کر دی۔

حیات طیبہ. ابھی مجاہدین اور روپیہ جمع ہونے کے لئے. عرصۂ دراز کی ضرورت تھی. اس نظریہ سے بہتر سمجھا گیا کہ حج بیت اللہ کرنا چاہئیے جب تک تنہا چندہ اور آدمی بہت کر لیں گے۔

سیرت سید احمد شہید چنانچہ لکھنؤ سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے رفقاء خاص..... کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا کہ اپنے خانگی معاملات سے فراغت حاصل کر لیں. تاکہ جہاد کے لئے چل سکیں، اسی اثناء میں اچانک آپ نے ادائے حج کا ارادہ فرمایا. فرمایا کہ..... اب حج کو چلیں گے. حیرت کو دور کرنے کے لئے فرمایا. اب مرضی الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے" میرے نزدیک اس فیصلہ کی وجہ یہ تھی کہ حج جو متروک ہو گیا ہے اس کو جاری کرنے کی تدبیر یہی تھی. کہ خود حج کریں۔

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم بالا سے تنبیہہ ہوئی تھی کہ قصد جہاد قبل از وقت ہے ابھی شرائط پورے نہیں ہوئے ہیں. اور وہ شرائط کیا تھے اس کو عالم بالا کے راز دار ہی جان سکتے ہیں اور وہ کون ہیں یہ کسی کو نہیں معلوم. یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے تنظیم و تبلیغ سے منہ پھیر کر جہاد کا فوری ارادہ کیا تھا. غالباً اس میں بھی بالائی اشارہ تھا.. وہ اس اشارہ کی تعبیر و تصدیق شاہ اسمٰعیل نے کی تھی۔ اب لکھنؤ کے مناظرات اور شاہ عبدالعزیزؒ کے فیصلہ کے اثر سے سقم محسوس کیا اور اس کو مرضی الٰہی سے موسوم کیا گیا. ظاہر ہے کہ شاہ اسمٰعیل ہی کی وجہ سے دونوں مرتبہ

سہو واقع ہوا۔

بہر حال وجہ کچھ ہی ہو۔ جب حج کے متعلق رائے قائم کر لی گئی تھی تو اعلان بھی کر دیا گیا۔ دعوت نامے بھیجے گئے۔ اور مشتہر کر دیا کہ کل مصارف کے ذمہ دار سید صاحب ہوں گے۔ جس کا جی چاہے چلے۔ مفت کا حج ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ بغیر اسباب کے اس قسم کا اعلان حیرت زا ہو سکتا ہے۔ اسلئے کہ اسباب نہ ہونے کی وجہ سے ارادۂ جہاد فسخ کیا گیا تھا۔ اس کو کرامت ہی کہا جا سکتا ہے اور کرامت کے متعلق کسی کو حق نہیں کہ چون و چرا کرے۔ اعلان کے ہوتے ہی ہزاروں کا چندہ اور عازمین کا اجتماع ہو گیا۔ جب زائرین کی تعداد چار سو ہو گئی تو ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں بقول مولانا مہر صاحب۔

شوال کی آخری تاریخ کو یا بروایت دیگر بعد نماز عید یکم شوال کو یہ قافلہ رائے بریلی سے روانہ ہوا[۱] اور ساڑھے چار ماہ بعد چندہ اور آدمی جمع کرتا ہوا صفر ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ پہنچ گیا۔ بندرگاہ بمبئی سفر حج کے لئے آسان و مناسب تھی اور بقول مرزا حیرت یہیں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے اور جناب مہر صاحب وغیرہ کی تحقیق ہے کہ کلکتہ سے جہاز لئے تھے۔ کثرت رائے کی وجہ سے یہی بات معتبر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں کئی بھید ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلکتہ میں مسلمانوں کو انگریزوں نے وبال پسرت کر دیا تھا۔ لہذا مسلمانوں کو مراعات دلوانا تھیں۔ پھر یہاں شاہ عبدالعزیز رح کے مریدوں اور شاگردوں کی کثرت تھی۔ اور حاجی شریعت اللہ نے بھی مسلمانوں کی بہتری کے لئے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیدیا تھا۔ اور اپنے جھنڈے کے نیچے بہت سے غازی مشرقی بنگال میں جمع کر لئے تھے۔ لہذا ان سے مل کر بھی گفت و شنید کرنا تھی۔ اثنائے راہ میں جن جن مقامات میں قیام فرمایا۔ وہاں دل کھول کر لوگوں نے استقبال کیا۔ قیاس سے زیادہ فتوحات

---

[۱] کوڑہ جہاں آباد۔ بھوہ۔ فتح پور۔ رائے بریلی۔ (باقی برحاشیہ صفحہ ۱۹۹)

حاصل ہوئیں۔ اور ہر قیام میں جس جس نے مدارات کی ان میں زیادہ تر امراء و رؤسا وہ تھے جن کی رسائی انگریزوں کی خدمت میں تھی۔ اور بعض جگہ خود انگریز تاجروں نے بھی خاص طور پر تواضع کی۔ کانپور میں منٹو صاحب کی میم مرید ہوئی۔ اور سات روز دونوں وقت دعوت کی۔ اور ایک مکان مع سامان نذر کیا تو اسی کو متولیہ بنا دیا کوڑہ جہان آباد سے مجاہدین پہنچے پھر کھجوہ اور فتح پور ہوتے ہوئے رائے بریلی آئے۔ اور ایک ماہ قیام کیا۔ اب دہلی سے حج کے لئے قافلے آنا شروع ہو گئے۔ غرض مجمع چار سو کا ہو گیا۔ پھر حج کے لئے روانہ ہوئے۔ ڈلمئو سے کشتیوں میں سے موضع گڈھ میں امام حسین کے نام کے چبوترے کھدوائے۔ اور علموں کو تباہ کیا۔ آگے چل کر ایک انگریز کھانا لایا اور دو گھنٹے حاضر رہ کر چلا گیا۔ یہ نیل کا سوداگر تھا۔ (سوانح احمدی)

بروایت وقائع "سید صاحب نے وعظ فرمایا" معلوم نہیں لوگ ان کا مفہوم سمجھے یا نہیں، اس لئے کہ سید صاحب کم گو تھے۔ اور ان کی زبان صحیح الفاظ ادا نہیں کر سکتی تھی . . . . موضع گڈھ میں

مولوی باقر علی نے اس کی بیعت کی۔ شاہ اسمعیل اور مولانا عبدالحی نے انہیں قائل کر دیا۔ جہیری کے بعد اوجھنی سے آگے بڑھے۔ تو ایک انگریز کی مسلمان بیوی (مخولہ کسبی) نے دعوت دی۔ مگر قبول نہیں کی۔ مگر اس انگریز کی دعوت قبول کر لی۔ الہ آباد میں شیخ غلام علی وغیرہ سے بیحد دولت ملی۔ اور سامان علیحدہ۔ مرزاپور میں ایک طوائف نے بیعت کی۔ شاہ اسمعیل نے اپنی بہن سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھا لو تکلف کے بعد

(بقیہ صفحہ ۹۸ - ڈلمئو۔ کانپور۔ دلمی دھرمہ۔ ڈلکدی۔ کلکتہ۔ کیا جہیری۔ الہ آباد۔ سرا مرزاپور۔ چنار گڈھ۔ بنارس۔ زمانیہ۔ غازی پور۔ باڑا۔ بلیا۔ بکسر۔ چھپرا۔ دانا پور۔ پھلواری شریف۔ عظیم آباد۔ باڑھ۔ مونگیر۔ بھاگلپور۔ راج محل۔ مرشد آباد۔ ہگلی۔ پرمٹ۔ بیشیہ مہوپور آخری مقام کلکتہ (سید احمد شہید)

بھٹا لینا پڑا۔ یہاں سے بھی دولت کثیر ملی، بنارس میں باوجود بارش کے دعوتوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ عید قرباں میں جانور قربان کئے۔ وہاں کے مسلمانوں کے اختلاف کو دور کیا۔ تلو کا چمار کو مسلمان کر کے اس کا نام الٰہی بخش رکھا۔ تیموری شہزادے بھی سلام کو حاضر ہوئے۔ اگسٹس برس کی بیوی[1] (مذکرہ کسبی) نے سات ہزار روپیہ نذر کیا جس کو قبول نہیں کیا، کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کے بعد اس کے مختار عام نے بیگم (یعنی اسی کسبی) کی دس ہزار رقم سے تجارت کی۔ اور اس سے جو اثیر نافع ہوا۔ وہ وقت روانگی جہاز نذر کی۔ اور قبول کر لی گئی۔ اسلئے کہ اس میں حرام کا شائبہ نہیں رہا تھا۔ زمانیہ پہنچ کر سب نے کبڈی کھیلی۔ غازی پور میں ایک پیرزادے نے دعوت کی۔ مگر بیعت نہیں کی چھپرے میں چند طوائفوں نے نذرانہ دیئے۔ مگر قبول نہیں کئے گئے۔ داناپور میں شیخ علی جان نے کہا کہ کئی صوفیوں سے بیعت کی ہے۔ مگر حالت نہیں بدلی۔ مگر سید صاحب کی بیعت سے تسکین ہوئی۔ پھر تعزیہ خانہ کو مسجد بنایا اور امام باڑہ کو مسافر خانہ میں منتقل کیا۔ جہاد کی رقمیں ان کے پاس جمع تھیں۔ داناپور میں کسبیاں تائب ہوئیں۔ اور دولہوں سے ان کا نکاح پڑھوا دیا (سوانح احمدی)۔ عظیم آباد میں مولوی ولایت علی کے والد وغیرہ سے ملے اور انہوں نے بیعت کی۔ مرشد آباد میں بوجہ فیض کوئی ملاقات کو نہیں آیا (سوانح احمدی)۔ شیعوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر حاکم نے فرقہ وارانہ رقابت سمجھ کر شکایت پر اعتبار نہیں کی۔

ابتداء میں جب قصبہ پھلاون کی مسجد میں ہاتف غیب نے بشارت دی کہ سب ہمراہیوں کو بخش دیا۔ پھر غیبی ہاتھ نے مسجد کو اٹھا کر جنت ماویٰ میں داخل کر دیا۔ بمقام ڈلمئو قادر برحق کے وعدے کا اعلان فرمایا کہ ہمارے ساتھی اب اللہ کے مہمان ہیں۔

---

[1] سوانح احمدی نے اسکو خاندان تیموریہ کی مالدار حیات النساء بیگم لکھا ہے۔

اور میرے ہاتھ سے لاکھوں کو ہدایت نصیب ہوگی۔ دعائے فتح حرمین بھی مستجاب ہوئی۔ غرض ردّ بدعات، منع شرک، ترغیب احکام شرعی کے متعلق مولانا عبدالحی تلقین فرماتے ہوئے اور سید صاحب مژدے سنا سنا کر، بڑی کرامتوں سے قلوب پر تصدیق کی مہر لگاتے ہوئے مع قافلہ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا۔

"اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے امر سے معلوم کرتا ہوں کہ اسی شہر میں باب ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران ہو جائیں گے۔ کلکتہ میں قیام تین ماہ امین الدین احمد وکیل سرکار کے یہاں رہا۔ یہ وکیل صاحب بڑے مالدار تھے اور عیش سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شراب کے عادی تھے۔ ایک طوائف سے آشنائی تھی۔ سید صاحب نے ان کے یہاں ممنوعات شرعی دیکھ کر سب سامان پھینکوا دیا۔ ایک روز وحیدالدین کی موجودگی میں امین الدین کی معشوقہ زندی آگئی۔ اتفاق سے اسی وقت سید صاحب بھی پہنچ گئے۔ زندی کو چھپا دیا گیا۔ اس کوٹھری پر وحیدالدین نے کہا کہ مریض مرض اور طبیب حاذق حضور میں حاضر ہیں۔ تو سید صاحب نے اس عاشقین پر وعظ فرمایا۔ وہ کسبی جو کوٹھری میں بند سن رہی تھی، نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگی دروازہ کھول کر حاضر خدمت ہوئی۔ اور توبہ کرکے مرید ہوگئی۔ اس کے بعد امین الدین نے بیعت کی۔ تو سید صاحب نے دونوں کا نکاح کروا دیا۔ مگر صاحب مخزن احمدی نے ذرا فرق سے اس قصہ کو لکھا ہے۔ یعنی جب نوکر نے جام شراب منشی امین الدین کو دیا۔ تو دیکھا کہ سید صاحب دانتوں میں انگلی دبائے موجود ہیں۔ کئی مرتبہ تصور کا یہی واقعہ پیش آیا۔ اس طرح شراب سے توبہ کی۔ (سوانح احمدی) بے نکاح بیبیوں کے بھی نکاح کروائے۔ غیر مختونوں کے ختنے کروائے۔ شراب بند کروا دی۔ تو شراب کی سب دکانیں بند ہوگئیں۔ ٹیپو کے شہزادوں نے عربی میں گفتگو کی اور سید صاحب

نے جواب دیکر قائل کیا۔ کلکتہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی۔ وہ ٹھیک نکلی شب و روز نیاز مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ دوران قیام میں کلکتہ رشکِ ارم بن گیا تھا۔ بعض حاسدوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ انگریز کے خلاف جہاد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ انگریزوں نے حاجی جیون کی معرفت اپنے یہاں وعظ فرمانے کی دعوت دی۔ اور شاہ اسمٰعیل نے جاکر دس ہزار انگریز مرد اور عورتوں[۱] کے مجمع میں وعظ فرمایا۔ اثر اس قدر ہوا کہ سب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اگرچہ مطلب سمجھ میں نہیں آیا جب نذرانہ پیش کیا تو واپس کر دیا کہ ہم اُجرتِ وعظ نہیں لیا کرتے۔ مولانا مہر نے انگریزوں کے یہاں اس وعظ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پھر کلکتہ میں "سوانح احمدی" کے مطابق کسی نے شاہ اسمٰعیل سے سوال کیا تھا۔ کہ انگریزوں سے جہاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تو شاہ اسمٰعیل نے واضح کر دیا کہ ایسی بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار سے کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔ مولانا مہر اس روایت اور "سوانح احمدی" کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ اس روایت کو اسلئے مسترد کر دیا کہ مہر صاحب کو تاریخی واقعات اور انگریزوں کے سلوک کا علم ہے۔ اور وہ انگریزی سرکار کو بے رو ریا غیر متعصب سمجھنے کو غلط سمجھتے ہیں مگر کیا کیا جائے۔ کہ شاہ اسمٰعیل نے خفیہ سفر پنجاب کے بعد ہی رائے قائم کی تھی کہ انگریز رحمدل ہیں۔ اور سکھ ظالم و جابر ہیں۔

مختصر یہ کہ جب بروایت "سوانح احمدی" عازمین حج کی تعداد رائے بریلی میں جو چار سو تھی[۲] اور "سیرت سید احمد شہید" الہ آباد میں سات سو ہو گئی۔ پھر مہر صاحب کی "سید احمد شہید" کے مطابق کلکتہ میں سات سو تریپن تک پہنچ گئی۔ نفوس ذی فلد کے لئے

---

[۱] تاریخ اس تعداد کو گوارا نہیں کر سکتی اور خصوصاً اسلئے کہ ابھی تک انگریز عورتیں ہندوستان میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اور انگریز پیشہ ور عورتوں کو ملازم رکھتے تھے۔

[۲] لیلےٰ را بہ چشم مجنوں باید دید۔

دس گیارہ جہاز کا انتظام کیا گیا۔ مگر ان جہازوں میں غیر مسافر بھی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کلکتہ جو رشک ارم بن گیا تھا۔ محض تزئین کا اضافہ کر سکا اسی سے کلکتہ پر اب ہدایت کے مفتوح ہونے کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے الغرض اس جلوس کا نظارہ مسلم و غیر مسلم اپنی اپنی چھتوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور خوش قسمتی سے لاٹ صاحب[1] نے بھی اپنی کوٹھی سے یہ تماشا دیکھا تھا (سیرت سید احمد شہید)۔ مگر وہ نظارہ قابل دید تھا جبکہ لنگر اٹھتے وقت ایک انگریز نے وحشت میں رواں دواں آکر سید صاحب کی خدمت میں نذر عقیدت کے طور پر کھانا پیش کیا تھا۔ اور سید صاحب نے فخر و مسرت کے ساتھ قبول فرمایا تھا۔ سید صاحب کے سامان پر جو جہاز پر لادا گیا تھا ایک سو ستائیس کا نمبر لکھا گیا تھا تاکہ امتیاز کیا جا سکے۔ از روئے ابجد سید صاحب کے نام کے اتنے ہی عدد ہوتے ہیں[2]۔ سید صاحب کا جہاز سب سے آخر میں روانہ ہوا تھا۔ الوداعی ہدایتوں میں سید صاحب نے خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی تھی کہ جو شخص کہے کہ سید احمد کی توجہ میں تاثیر تھی۔ اسے مفتری سمجھنا۔ یہ بات محض ناخوب۔ شد ہے۔ اس کے بعد سیلون۔ رلپی۔ کالیکٹ۔ لنکادیپ۔ بمبئی۔ عقیدی۔ سقطرہ۔ عدن مخا۔ حدیدہ۔ جدہ اور حدیبیہ کی راہ سے ۱۲۳۷ھ کو بتاریخ ۲۸ شعبان (۲۱ مئی) مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ گویا یہ سفر دس ماہ میں طے کیا۔ اس بحری سفر کے عجائب و غرائب بے شمار ہیں۔ بوجہ جہازی بیماری مولانا عبدالحی سے مسئلہ دریافت کر کے جمع بین الصلاتین کا حکم دیدیا۔ کوئی پشت پر آتا تو سید صاحب سلام کرتے اور سلام میں کسی کو سبقت نہیں

---

[1] اس زمانہ میں لاٹ ہیسٹنگز تھا۔

[2] یہ یا تو ایزدی حکم تھا یا شاہ اسمٰعیل کی جدت تھی یا انگریزوں کی تقلید۔

کرنے دیتے۔ لنکا کے قریب شیاطین نے حملہ کیا۔ مگر شکست دیدی (سوانح احمدی)
کچھ حالات سید صاحب نے شاہ عبدالعزیزؒ کو تحریر فرمائے تھے۔ اور اس خط کو شاہ اسمٰعیل نے طبع کرواکر سب میں تقسیم کیا تھا۔ "سوانح احمدی" کے مکتوب نمبرا صد ۱۶۹ کا خلاصہ یہ ہے:۔

"آخری ماہ شعبان ۱۲۳۷ھ۔ ہم بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں حج زیارت مدینہ کا عزم ہے ... (مختلف مشغولیتوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے)۔
رائے بریلی کے نئے مکان کی روحانیت نے مجسم ہوکر وقت وداع گریہ د زاری کی۔ میں نے بہ حکم خدا اسے جنت میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کرکے تسلی دی۔ ڈلمئو سے جب ہم کشتیوں میں سوار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ فلاں کشتی میں تم نہ بیٹھنا۔ اسے ہم غرق کردیں گے۔ مگر میں اپنی خطا کو محسوس کرکے اسی میں سوار ہوا۔ غیب سے ارشاد ہوا کہ تیری وجہ سے ہم نے حکم واپس لے لیا۔ اور کشتی کو غرق نہیں کیا۔ جب کلکتہ سے چل کر دریائے شور میں پہنچے تو سمندر کی روحانیت نے مجسم ہوکر مجھے ڈرانا چاہا۔ میں نے کہا: میں اور تو دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ تو اللہ سے ڈر۔ میں تجھ سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ پھر وہ منفعل ہوکر قائل ہوگئی۔ جب جہاز قاب وقری میں پہنچا جو بے حد خطرناک مقام ہے تو تجلی نمودار ہوئی اور فرمایا۔ تجھے غرق کردیا جائیگا۔ میں نے سر نیاز جھکا دیا۔ ارشاد ہوا۔ اب غرق نہیں کریں گے۔[1] عدن میں نماز جمعہ وہاں کی جامع مسجد میں پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر اہل قافلہ کی وجہ سے متردد تھا کہ ان کو ساتھ لے جانا مشکل ہے۔ بشارت ہوئی کہ تم نماز پڑھنے جاؤ۔ جہاز پر قافلہ کی نگرانی ہمارے ذمہ ہے.... میری دعا کی اجابت کی بشارت ہوئی۔ کہ تیرے ہاتھ سے نشر و اشاعت ملک عرب میں ہوگی اور اسکے

---

[1] اس خوشی میں سید صاحب نے جہاز پر محفل میلاد منعقد کی تھی (سوانح احمدی صد ۸۰)

آثار اقالیم روم تک پہنچیں گے ..... نخا میں اسی طرح ایک ماہ کے قیام ہزاروں نے بیعت کی۔ بتایا گیا۔ اس سال جتنے حج کریں گے تیری وجہ سے سب کو بخش دوں گا۔ محاذ یلملم براحرام کے لئے میں نے غسل کیا۔ جن لوگوں نے مجھے غسل کرایا، ان سب کی بخشش کی اطلاع دی گئی۔ پھر خبر دی گئی کہ جو تلبیہ میں تجھ سے سبقت کرے گا اس کا تلبیہ میں نہیں سنوں گا۔ بیرذی طوئے سے گذر کر عجیب حالت طاری ہوئی اور حاضرین نے دیکھا کہ میری لبیک کو شرف اجابت بخشا گیا۔ اور ارشاد ہوا۔ کہ جتنے گنہگار، شرمندہ دور سے ہمارے حرم میں آتے ہیں۔ ان کو بخش دیا ہوں اور مدعا ایسا ہے تو خود مستحق رحمت وعنایت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جندسے۔ تمہارے بخارا تک سب کو بخش دیا۔ مجھے خطرہ و خیال ہوا کہ یہ عنایات حق احیاء کے لئے ہیں یا اموات بھی اس میں داخل ہیں۔ جواب ملا کہ سب کیلئے ہیں۔ چنانچہ سب کو رنج و تکلیف سے نجات مل گئی۔ اور وہ سب خوش ہو گئے۔ . .

(آخر میں تحریر ہے کہ ... دریں سفر سعادت اثر بسیار بشارات و عنایات رفیعہ از درگاہ رحمان جل شانہٗ۔ ایں فقیر یافتہ است۔ اور یہ سب آپ کی توجہ کا صدقہ ہے۔ آئندہ بھی دعا فرمائیں (اور اس خط کو اس جملہ پر ختم کیا ہے کہ زیادہ بجز آداب چہ عرض نماید۔ والسلام والاکرام "

اس خط کو سن کر شاہ صاحب کے دوست مولوی محمد نعیم صاحب نے اعتراض کیا تھا چنانچہ شاہ صاحب نے بذریعہ خط اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ سوانح احمدی خط نمبر ۲) ا۔

" از جانب خدا برائے تربیت طفلانِ طریقت کہ تابع شخصے شوند۔ آنہا را بسوی فطرت رضا کنند۔ اتفاق شود۔ مانند آں کہ طفلے در مکتب می برند و استاد او ..... او را مواعید عمدہ می دہند کہ برائے تو خلعتے ساختہ ام . . . . .

وعلیٰ ہذہ القیاس۔ اللہ وُنی حدیثِ چہل ابدال کا وجود ثابت ہے..... چہ تعجب است کہ میر سید احمد را بعضے مراتب حاصل شدہ باشد۔ لہٰذا انتظار باید کشید کہ حق تعالےٰ آثار ایں مواعید را بر منصۂ ظہور جلوہ گر سازد۔ پس ایں ہمہ صادق اللہ زیادہ بجز ترقیات دارین چہ نویسد ۔"

معلوم نہیں یہ خط شاہ صاحب کا ہے بھی یا نہیں۔ اسکو سخن سنج ہی سمجھ سکتے ہیں اس کے علاوہ سید صاحب کو آداب سے نفرت تھی۔ چنانچہ خاندان ولی اللہی کو آداب کہنے کی وجہ سے تنبیہہ بھی فرمائی تھی۔ مگر اس خط میں خود اس لفظ کو استعمال کیا ہے ہو نہ ہو یہ یقیناً شاہ اسمٰعیل کی کرامت ہے۔ میرزا حیرت نے لکھا ہے کہ :۔

" ہمارے فاضل عبد القیوم بریلوی نے سید صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اور بڑی بڑی کرامتیں سید صاحب کے آباؤ اجداد کی نہایت رنگ آمیزی سے بیان کی ہیں۔ مگر یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ باوجودیکہ مصنف کتاب کرامات مافوق الفطرت کا قائل ہے۔ پھر بھی اس نے سید احمد صاحب کی ان کرامتوں کا جن سے ہمارے معاصر سوانح نویسوں کے صفحے سیاہ ہو رہے ہیں کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ بجائے اس کے پارسا، پرہیزگار، صائم الدہر، سچا، نیک بخت، شیریں کلام، خلیق، خود فروشی و خودنمائی سے کوسوں دُور، جیسی صفتوں سے بریلوی نے سید صاحب کو یاد کیا ہے؟

لیکن بالفرض ان کرامتوں کو مان بھی لیا جائے۔ تو شاہ عبد العزیز کا مندرجہ بالا خط ان کرامتوں کی حقیقت بیان کر رہا ہے کہ یہ سب بچوں کا کھیل ہیں۔ اسکے علاوہ کمال یہ ہے کہ سوانح نویس جن مافوق الفطرت کرامتوں کے ذریعہ اشتہار دیتے ہیں۔ کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ خود اپنے قلب میں عقیدہ نہیں رکھتے اور دوسروں کو منوا کر خوب مضحکہ اڑاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان کرامتوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو قلعی کھل جاتی ہے۔ بہرحال ۲۰، شعبان ۱۲۳۷ھ کو حرم محترم میں داخلہ ہوا اور یکم ذیقعدہ

۱۲۳۹ھ کو حجاز سے واپس آئے۔ مکہ معظمہ میں ابتدائی قیام کی مدت چار ماہ ہے۔ اس عرصہ میں فتوحات، عنایات اور نشر و اشاعت کا ذکر آب و تاب سے لکھا گیا ہے۔ مدینہ منورہ میں پچیس دن یا ایک ماہ گذارا۔ پھر وہاں سے واپس آکر مکہ مکرمہ دو یا ڈھائی ماہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ مگر اس قیام کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سفر حج کے جو حالات لکھے گئے ہیں۔ ان کا مطالعہ و مقابلہ بصیرت افروز ہوگا۔ لہذا ملاحظہ ہو۔

سوانح احمدی۔ جہاز سے اُتر کر جدہ میں پانچ روز قیام کیا۔ بعد نماز عشاء اونٹوں پر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ میں یاروں کے ساتھ دعا میں مشغول رہے۔ ..... داخل حرم ہونے پر مسجد کو دیکھ کر قافلے والوں پر اس قدر رقت و زاری طاری ہوئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ یہاں تک کہ معلم و مطوف اور حاضرین سب کے سب رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنی ساری عمر میں ایسا بابرکت قافلہ کسی ملک سے آتا ہوا نہیں دیکھا ملک عرب کے بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بلغار کے قافلہ کا ایک بہت بڑا عالم جو فارسی جانتا تھا۔ بیعت سے مشرف ہوا۔ اس کو ملک بلغار کی ہدایت کے لئے خلیفہ مقرر کیا اور ایک نقل صراط مستقیم کی عنایت فرمائی۔ مکہ کے تین بزرگ صاحب کمال اولیاء میں سے تھے۔ انہوں نے کشف باطن سے معلوم کر کے اطاعت و فرمانبرداری کی۔ یہ تینوں سید صاحب کے ساتھ طواف کیا کرتے تھے۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو جواب دیا کہ اس بزرگ کا ہر طواف مقبول بارگاہ ایزدی ہے۔ اور ان کے ساتھ طواف میں رہنے والوں کا بھی طواف مقبول ہے:

جبل رحمت پر دعا مانگی کہ ہمارے قافلہ والوں میں سے کسی کو بھی ساتھ لقب "حاجی" کے ملقب نہ کرنا۔ سب مورخین متفق ہیں۔ کہ یہ بہ قبولیت دعا کے آج تک کوئی آدمی اس قافلہ کا حاجی کے لقب سے ملقب نہیں ہوا۔ اس واسطے قوی امید ہے کہ باقی دعائیں بھی قبول ہوتی ہوں گی..... اب تیاری سفر مدینہ کی ہونے لگی

اثنائے راہ میں عرب کے لٹیرے گھات میں تھے۔ مگر کچھ ایسا ہوا۔ کہ ان کے سردار نے حاضر خدمت ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ آدھی رات کو وادی فاطمہ میں حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے مرقد مبارک پر واسطے زیارت کے تشریف لے گئے۔ صاحب "مخزن احمدی" کا کہنا ہے کہ خلاف فصل ہمیں وہاں تازہ انگور کے خوشے ملے۔ وادی صفرٰی میں شیخ عبدالرحیم اور حضرت ابو عبیدہ بن الحارث جو غزوۂ بدر میں زخمی ہوئے تھے۔ ان کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جب مدینہ تین کوس رہ گیا۔ تو سید صاحب کو بخار آ گیا۔ یہاں بھی لٹیرے حملہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر بخیر گذشت حضرت خاتون جنت اور حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے خواب میں بشارتیں دیں۔ باوجود بیماری کے متبرک مکانات کی زیارتیں۔ اہل مدینہ نے بیعت کی۔ دو دو گھڑی تک سید صاحب مرقد مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مراقب رہتے تھے۔

۲۶۔ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ کو خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی کہ مکہ کو واپس جاؤ۔ کیونکہ شدت سرما سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ لہذا ۲۹۔ ربیع الاول کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ مکہ شریف آ کر ۱۵۔ شوال کو ساڑھے چھ ماہ بعد وطن مالوفہ کو مراجعت کا الہام ہوا۔ پھر بادل محزون یکم ذیقعدہ کو جانب وطن روانہ ہوئے ..... جدہ میں چھ روز قیام کیا۔ اس سفر میں شاہ جنات اور اس کی ذریات کو بھی بیعت کا شرف عطا کیا۔ اور غائبانہ طور پر وہ حفاظت کیلئے ساتھ رہنے لگے۔ اس کی مفصل تفصیل وزیر الدولہ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ مخا میں پندرہ روز قیام رہا۔ پھر یہاں سے چودھویں روز بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں تھوڑا قیام کیا۔ یہاں سے ایک مہینہ کے بحری سفر کے بعد کلکتہ تشریف لائے اور دو ماہ سے زیادہ قیام رہا۔

حیات طیبہ بمبئی سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جدہ پہنچتے پہنچتے دو تین

جانیں تلف ہو گئیں۔ حاملہ عورتوں کے بچے پیدا ہو گئے۔ ایک کا حمل گر بھی گیا تھا جدہ والوں کو سید صاحب کے آنے کا علم نہ ہوا۔ اسلئے آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ وہ لوگ حاضر خدمت ہو کر بہت پریشان کرتے۔ مکہ شریف میں پہلے سے خبر ہو گئی تھی کہ وہابیوں کا قافلہ آ رہا ہے وہابیوں کی پابندی شرع کی وجہ سے مکہ و مدینہ والے خائف تھے۔ سید صاحب وغیرہ کو شریف مکہ نے طلب کیا۔ انہوں نے اپنے عقائد کے متعلق صفائی پیش کر دی[1]۔ تو نجات مل گئی۔ پھر شریف مکہ نے اپنے یہاں مہمان رکھا اس کے بعد ہر بلا سے محفوظ ہو گئے۔ در وطن کو بخیریت واپس آئے حج بیت اللہ کے وقت نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ہیوجز نے لکھا ہے کہ۔

"سید صاحب نے نجدیوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ان سے عقائد لئے تھے مگر یہ غلط ہے۔ ان کو تعلیم دینے کے لئے ان کے ہمراہ خود شاہ اسمٰعیل مولانا عبدالحیٔ اور دیگر علماء موجود تھے۔ سید صاحب کا اثر بمبئی میں اتنا نہیں تھا جتنا کلکتہ میں تھا ہندوستان آکر جہاد کی تحریک شروع کی۔ ٢٩۔ شعبان ١٢٣٣ھ کو وطن میں داخل ہوئے۔

سیرت سید احمد شہید اس ارض مقدس میں آپ کا فیض بند نہیں ہوا۔ حجاز کے بعض نامور اہل علم و کمال و فضل و صلاح بیعت میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کے حکم سے مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ نے برابر وعظ فرمائے۔ یہاں تمام ممالک اسلامیہ کے وفود آتے ہیں۔ اسلئے باہر کے لوگوں کو بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ بلغار کے قافلہ نے بیعت کی۔ مغربی قافلہ بھی بیعت سے مشرف ہوا۔ مولانا عبدالحیٔ نے صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کر کے اس کی نقلیں تقسیم کیں۔ بعد ختم مراسم حج اور ہونے جبل رحمت پر دعا مانگی۔ کہ ہمارے قافلے کا کوئی آدمی بھی حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہو۔

---

[1] کسی نے یہ نہیں بتایا کہ سید صاحب نے کس زبان میں گفتگو کی اور کیا صفائی پیش کی کہ وہ وہابی نہیں ہیں۔

جاوا کے تین آدمیوں نے بیعت کی۔ مکہ مکرمہ سے آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور کافی قیام کیا۔ ۹۔ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ آئے اور وہاں رمضان و عید کے مہینے گذارے اور یکم ذیقعدہ ۱۲۳۷ھ کو مکہ مکرمہ کو الوداع کہا۔ ۲۹۔ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ مہینے کے بعد وطن آ گئے۔

سید احمد شہید ایک مہینہ قیام کر کے مخا سے چلے تو حدیدہ ٹھیرے یلملم کے محاذ میں پورے قافلہ نے غسل کر کے عمرے کا احرام باندھا۔ صدائے لبیک سے پورا جہاز گونج اُٹھا.... جدہ میں اما حوا کے مزار کی زیارت کی۔ جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے ان میں اکثر مکہ معظمہ جا چکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے انتظار میں ٹھیرے رہے.... مولانا اسمٰعیل کو یہاں محاصل کے تصفیہ کیلئے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہو گئے..... کلکتہ میں مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کیلئے دیدی گئی تھیں۔ جدہ میں ان رقموں کا حساب لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپیہ زائد خرچ ہوئے..... سید صاحب نے یہ رقم ادا کر دی۔ جدہ کے بعد ایک مقام حدیدہ میں قیام کیا۔ پھر حدیبیہ ٹھیرے.... تیسرے روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے.... قافلہ کے لوگ خدا کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ مکہ معظمہ میں دیر تک حضرت خدیجہ کے مزار پر مصروف دعا رہے۔ عبید اللہ کی بیوی سے نوزائیدہ بچی کو دودھ پلانے کو کہا۔ بعد کو سید صاحب کی عبادت میں پریشانی ہوئی تو اس سے معافی مانگی۔ شاہ اسمٰعیل کی والدہ ایسی بیمار ہوئیں کہ زندگی کی امید نہیں رہی۔ شاہ صاحب کی آرزو تھی کہ والدہ صاحبہ سید صاحب سے بیعت کر لیں۔ لیکن وہ فرماتیں کہ یہ تو خود ہمارے خاندان کے مرید ہیں میں بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب ان کے مرید ہونے کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا تو اس کے مطابق سید صاحب سے

بیعت کرلی، اسی بیماری میں دوسرے دن فوت ہوگئیں۔ اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں ...... ادائیگی حج کے موقع پر جبل رحمت پر دعا مانگی کہ قافلے والے حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہوں۔ اسلئے کہ حج اسلامی فرض ہے۔ اسے بجا لانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے ...... سینکڑوں علماء و صلحاء و اشراف سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک مغرب اقصٰی کے تھے ...... جاویوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی۔ مولانا عبدالحی نے حرم پاک میں مشکوٰۃ کا شاہ اسمٰعیل نے حجۃ البالغہ کا درس شروع کیا۔ مولانا عبدالحی نے اس اثنا میں صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کیا جس کی نقلیں بعض اصحاب نے لیں[1]۔ اواخر محرم میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ راستہ میں سید صاحب سخت بیمار ہوگئے۔ بعض اوقات بیہوش ہو جاتے تھے۔ مگر مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے تندرست ہوگئے۔ آدھی رات کے وقت مدینہ منورہ پہنچے۔ سافریں اترے۔ غسل کر کے لباس بدلا۔ صبح کو شہر کا دروازہ کھلا۔ تو اندر داخل ہوا۔ حرم مدینہ کے تمام مآثر کی زیارت کی۔ اس زمانہ میں نجدیوں سے ارباب حکومت بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ ختم ہوئے چند سال ہی گذرے تھے۔ اگر کوئی شخص موحدانہ عقیدے کی اشاعت میں سرگرم ہوتا۔ اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے وہابی سمجھ کر مواخذہ کا تختہ مشق بنالیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے۔ ان کی شکایت ہوئی کہ وہابی ہیں۔ ان پر مقدمہ چلا تو مولٰینا عبدالحی نے ضمانت و وکالت کر کے نجات دلوائی۔ مدینہ منورہ میں سید عبدالرحمٰن نے دو پستول خریدے۔ مگر وہ چوری کے تھے۔ لہٰذا حاکم احمد شاہ کو واپس کر دیئے حضرت

---

[1] حیرت ہے کہ عربی میں لکھی ہوئی تقویۃ الایمان یعنی رد الاشراک تقسیم کیوں نہیں کی۔ شاید اسلئے کہ تقویۃ الایمان مسترد و منسوخ ہو چکی تھی۔

ابو عبیدہؓ کے مزار کی زیارت کی۔ نواب وزیر الدولہ نے زیارت رسولؐ اور قرآن کی اجازت کا خواب لکھا ہے (وصایا) ... بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا مگر ہمراہیوں کے اضطراب کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اسلئے کہ سب کو لے جانا مشکل تھا اور پیچھے چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ مدینہ میں سردی تیز ہوگئی تو واپس آئے۔ دس گیارہ دن سفر میں لگے۔ ایک مہینہ مدینہ منورہ میں گذار کر ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو واپس ہوئے۔ وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ جس روز مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ اسی روز رات کو بخار آگیا تھا۔ .... اپنے قیام گاہ کی کھڑکی میں روضۂ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عرض کیا کہ " غلام علی الہ آبادی نے جو قرآن شریف یہاں کی تلاوت کے لئے بھیجا ہے۔ اگر حضور اجازت دیں تو الماس صاحب کو وہ نسخہ دے دوں کیونکہ وہ باقاعدہ تلاوت کے عادی ہیں۔ ورنہ یہاں قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں۔ اور کوئی تلاوت نہیں کرتا ..... مکہ شریف اگر ہمراہیوں میں سے جن جن کیلئے جہاز میں جگہ نکلتی گئی انہیں ہندوستان بھیجتے گئے۔ خود پہلے کی طرح مشغول عبادت رہے ..... فرماتے ہیں کہ خیال آیا ہندوستان دار الحرب ہے۔ بہتر ہے۔ کہ حرم پاک میں بیٹھا رہوں۔ لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ اگر تم نہیں جاؤ گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لے لیں گے۔ اسی پر واپسی کا ارادہ پختہ ہوگیا۔ ۱۵ شوال کو مکہ سے چلے۔ ذیقعدہ کے آغاز میں جدہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے کہ چار جہاز کرایہ پر لینے پڑے (گویا نصف سے زیادہ ساتھی روانہ کئے جا چکے تھے) مخا میں ایک مہینہ گذارا پھر ذوالحجہ کو بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں سے الچی وغیرہ ہوتے ہوئے ۲ صفر ۱۲۳۹ھ کو کلکتہ آ گئے۔ کلکتہ میں خاصی دیر قیام رہا۔ پھر مختلف مقامات پر ٹھیرتے ہوئے دو سال

دس ماہ بعد ۲۹ شعبان سنہ ۱۲۳۹ھ مطابق ۹ اپریل سنہ ۱۸۲۴ء کو وطن آگئے۔ کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپیہ موجود تھے۔

سفرِ حجاز کے حالات و واقعات مختلف راویوں اور سوانح نویسوں کے بیان کردہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ سخن سنج اس کے مضمون آرائیوں کا خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خواب یک خواب است، اما مختلف تعبیرہا۔ ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ہر شخص نے اپنے قیاس سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اور حقیقت سے بے نیاز ہو کر ان سب کی بے تکی اور بوقلمونی ذہانت خود ہی کے ساتھ وقت کاٹنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مگر ان سب کے اختلافات نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اصلیت و واقفیت کچھ اور ہے۔ گپ والے ان بیانات اور خوش خیالیوں کا یہ ہے کہ خلاف قیاس واقعات زیادہ تر وقتی حاصل ہوتی کرامتیں حسب معمول تماشے دکھا کر جادو کا کام کرتی رہیں۔ ان کرامتوں کی تشریح شاہ عبدالعزیز والے خط میں موجود ہے جو انہوں نے مولوی محمد نعیم کو لکھا تھا یعنی اس طرح طفلانِ طریقت کو ایسے ہی ثبات کے ذریعہ ترغیب دی جاتی ہے تاکہ ہمت افزائی ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی حیثیت طفلِ طریقت سے زیادہ نہیں تھی۔ اس خط میں یہ بھی امید ظاہر کی گئی ہے کہ شاید آگے چل کر سید صاحب ابدال بنا دیئے جائیں۔ مگر عام طور پر ابدال مجذوب و مستتر ہوا کرتے ہیں۔ کشف و کرامات کے متعلق خود صراطِ مستقیم میں تحریر فرمایا ہے کہ

"ان طلسماتی نظاروں سے مومن کا ایمان، عزم و اتباعِ سنت بڑھتا ہے۔ لیکن وہ کمال جو انسان سے مطلوب ہے، ان کشف و کشود سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔" اس حقیقت کے کھل جانے پر ان کے معتقدین سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کرامتوں کا جو ڈھونگ رچایا ہے وہ کمال کی علامت کیسے بن گیا

یہ ان صاحبان کی عجائب پرستی اور بدعت دوستی کی دلیل ہے۔ انہوں نے ان کرتوتوں کے اظہار سے سید صاحب کو جھنجھنا بنایا ہے اور سیدھے سادے مسلمانوں کو فریب میں ڈالا ہے۔ اہل فہم اس حرکت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے کیلئے مجبور ہیں۔ الفاظ کو جمکاکر انہوں نے معنوں کو خبط کر دیا ہے۔ اسلئے ان کے عقائد بھی محجوب ہو کر رہ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قافلہ منصورہ کے پہنچنے سے پہلے یہ خبر مکہ معظمہ میں پہنچ چکی تھی کہ ان صاحبان کے عقائد نجدیوں اور وہابیوں جیسے ہیں یہی افواہوں سے بدگمانی پیدا ہو جانا فطرتی ولازمی تھا۔ قدم اوّل پر شریف مکہ نے ان سے استفسار کیا۔ اور بتایا گیا کہ انہوں نے صفائی پیش کر کے یقین دلا دیا کہ ہم نہ وہابی ہیں نہ نجدیوں کے اعتقادات رکھتے ہیں۔ ہر چند انہوں نے منطقی مغالطوں سے کام لیا ہو مگر اسی کو تقیہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال شریف مکہ کو مطمئن کر دیا گیا مگر یہ دروں خانہ کی صفائی افواہ کی عام شہرت کو نہیں مٹا سکتی تھی اور اسی کو کہتے ہیں۔ بد اچھا بد نام بُرا۔ اس شک و شبہ کی حالت میں لوگ ان سے دُور رہے اور درمیان میں ایک خلیج واقع ہو گئی۔ لہذا پُر جوش استقبال کا دعویٰ اور ادعائے مقبولیت معلوم۔ مرزا حیرت کا دعویٰ ہے کہ حج میں نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی جس کی بنا پر ڈاکٹر ہیو جز نے یہ رائے قائم کی۔ انہوں نے نجدیوں سے عقائد مستعار لئے۔ مگر میرزا صاحب کو اس سے قطعی انکار ہے اور علانیہ کہتے ہیں کہ نجدیوں کی ملاقات سے پہلے ہی سے ان کے عقائد ذاتی طور پر ایسے ہی تھے۔ اور اگر ان کے عقائد میں کوئی سُقم ہوتا تو اس کو دُور کرنے کے لئے مولانا عبدالحی۔ شاہ اسمٰعیل اور دیگر علما خود ان کے پاس موجود تھے۔ لہذا نجدیوں سے انہوں نے سبق نہیں پڑھا۔ اس کے مقابل میں مولانا نعیم صاحب کا اعلان ہے کہ ترکوں اور مصریوں

نے نجدیوں کو اس درجہ کچل دیا تھا کہ حجاز میں آنے کی نجدیوں کو ہمت بھی نہیں تھی لہذا ایسی صورت میں نجدیوں کے حجاز آنے اور ان سے سبق لینے کی، خواہ غلط ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا تھانوی نے ملفوظات "حسن العزیز" کی جلد اول میں لکھا ہے کہ:۔

ترکوں کے تسلط کے بعد بھی حجاز میں نجدیوں کے خفیہ اڈے موجود تھے۔ چنانچہ ایک نجدی سے حاجی امداد اللہ کے مناظرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اس بیان سے میرے احتیاط سے بیان کی تائید اور جناب مہر کے ارشاد کی تردید ہو جاتی ہے "موج کوثر" میں شیخ محمد اکرام صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "سید صاحب کو حجاز میں وہابیوں کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملا تھا۔ سید صاحب کے اور وہابیوں کے عقائد میں بہت اشتراک ہے۔ اس لئے ان کے بہت سے ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہو گئے تھے... چنانچہ شاہ اسمٰعیل نے سفر حج سے واپس آکر اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ البتہ مولانا عبدالحی ان سے متفق نہیں تھے اور سید صاحب کے متعلق اختلاف رائے ہے"

جناب اکرام کی تحقیق مستشرقین جیسی ہے۔ جو محض قیاس سے گول مول نتیجہ نکال لیا کرتے ہیں اور کلیہ بنا بیٹھتے ہیں۔ اکرام صاحب نے تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کا خود مطالعہ فرمایا ہے۔ اور اس پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ انہوں نے نجدیوں کے اثرات کا حجاز میں قبول کرنا لکھا یہ حقیقت اور جناب مہر کا خیال یقیناً صحیح ہے کہ اس موقع پر نجدیوں سے ان لوگوں نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ مہر صاحب نے تو صاف کہا ہے کہ:

مدینہ طیبہ میں موحدانہ عقائد رکھنے کی وجہ سے مولوی عبدالحق بنارسی پر

له مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب

مقدمہ چاہتا تھا۔ تاریخ سے اگر شواہد طلب کئے جائیں تو واضح ہوگا کہ ترکوں کے تسلط کے بعد نجدیوں کا اثر مخا اور حدیدہ میں باقی و جاری تھا۔ وہیں سے یہ لوگ خفیہ طور پر حجاز کے اوپر اثر ڈالتے تھے اور سید صاحب کے حالات سے ظاہر ہے کہ آتے جاتے مخا میں طویل قیام کیا اور حدیدہ میں ہندوستانی دوست نے دعوت کی تھی قافلہ کے نجدی الخیال ہونے کی خبر حجاز میں یقیناً ان ہی مقامات سے پہنچی تھی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے خیالات و عقائد اس قافلہ کے سفر حجاز سے پیشتر کے تھے۔ اور تاریخی حقائق مظہر ہیں کہ اس قسم کے موحدانہ عقائد ہندوستان میں محمد تغلق کے عہد میں موجود تھے۔ اسی زمانہ میں ابن تیمیہ کی تعلیم ہندوستان میں رائج ہوتی تھی۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد سرہندیؒ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی تحریک نے ابن تیمیہ کی تجدید کو مخلوط کر کے موحدانہ عقائد کو فروغ دیا تھا۔ شاہ فخرؒ۔ شاہ ولی اللہؒ کے ہمعصر ہیں۔ ان کے ملفوظات سے منقول ہے کہ محمد فاخر نامی ایک عرب نے دہلی آکر اس قسم کی تبلیغ کی تھی۔ اور نجدیوں کے اصول کے مطابق دہلی میں قبروں اور قبوں کو ڈھانے کا آغاز کیا تھا۔ لوگ انہیں "وہابی لہابی" کہا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں بھی نجدی تعلیم کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ کتاب التوحید کا نسخہ سب سے پہلے ایک مرادآبادی صاحب حجاز سے یہاں لائے تھے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے جملہ سامان دہلی میں سید صاحب کی بیعت اور تبلیغی دوروں سے پہلے ہی سے موجود تھے۔ اور اسی پر اپنی تجدید کی بنیاد رکھ کر شاہ اسمٰعیل نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ فرمانا شروع کئے تھے اور ان ہی "موحدانہ عقائد" پر علامہ فضل حق خیرآبادیؒ سے مباحثہ ہوا کرتے تھے۔ انہیں مباحثوں کی وجہ سے شاہ اسمٰعیل میں افراط و غلو کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے علی الرغم شرک کے دائرہ کو از حد وسیع کر دیا تھا۔ چنانچہ تقویۃ الایمان کا

مسودہ اپنے احباب کو دکھاتے وقت اس امر کا انہوں نے خود اقرار کیا تھا۔
"تحفہ محمدیہ" میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت شاہ اسمٰعیل تقویۃ الایمان لکھ رہے
تھے۔ اس وقت ان کا ایک شاگرد مسمی امام بخش اس کا مسودہ ہر روز رات کو
مولانا مملوک علی کو لے جا کر دکھا دیا کرتا تھا۔ اور وہ روزانہ اس حصہ کا رد لکھ لیا
کرتے تھے۔ چنانچہ جب تقویۃ الایمان مکمل ہوئی تو مولانا مملوک علی کا رد بھی تکمیل
کو پہنچا۔ اس رد کو مولانا مملوک علی نے ۱۲۴۰ھ میں شائع کیا تھا۔ مولانا مملوک علی
تقویۃ الایمان کا تلفظ قاف کو فے سے بدل کر کیا کرتے تھے یعنی ایمان کو
فوت کرنے والی کتاب کہتے تھے۔ اس واقعہ سے تقویۃ الایمان کی تصنیف
کا تعین ۱۲۳۱ھ سے پہلے کیا جا سکتا ہے۔ تقویۃ الایمان[۱] میں وہی مسائل ہیں
جن پر بحث ہوئی تھی۔ جہاد کے متعلق ایک حرف بھی اس میں موجود نہیں ہے اس
کے معنی یہ ہوئے کہ پنجاب کے خفیہ دورہ سے پہلے شاہ اسمٰعیل تقویۃ الایمان
لکھ چکے تھے۔ اور تقویۃ الایمان سید صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے یقیناً
بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ صراط مستقیم دراصل تقویۃ الایمان کی نقل رپٹ ہے
اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ بھی کی گئی ہے اور اس میں مسئلہ جہاد کا بھی ذکر ہے۔ ان
جملہ واقعات سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ سفر حج سے بہت پہلے ہی قافلے
والوں کے موحدانہ عقائد تھے۔ صراط مستقیم کا عربی میں ترجمہ کر کے حجاز میں
نقلیں تقسیم کی گئی تھیں۔ اس میں بھی موحدانہ عقائد بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اب وہ
کونسی عقل ہے جو اس بات کو تسلیم کرلے۔ کہ صراط مستقیم کے مضامین کو اہل حجاز
نے اچھی نظروں سے دیکھا۔ اور اس کی وجہ سے اس قافلہ کو وہاں مقبولیت

---

[۱] موجودہ تقویۃ الایمان کا دوسرا حصہ شاہ اسمٰعیل کی وفات کے بعد محمد سلطان خاں صاحب نے لکھا ہے مگر مطالب شاہ اسمٰعیل کے ہی ہیں (حیات طیبہ)۔ لیکن وہ کامیاب کے ساتھ نہ لکھ سکے (مرزا حیرت)

حاصل ہوئی۔ دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔ ان حضرات کے بیانات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ وہاں بیعت کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔ بلغار کا ایک عالم مرید ہوا تھا نہ بلغار کا کل قافلہ۔ جاویدان میں محض تین شخصوں کی بیعت کا اعلان ہے۔ یہی اقبال ہے کہ کل قافلہ نے بیعت نہیں کی۔ اس طرح پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ کہ اقالیم روم اور اقصائے بخارا تک ان کی تعبیر کی رسائی ہوئی۔ لہذا یہ بھی داستان حسن زیب داستان ہے اور صفحہ قرطاس کی رونق ہے۔

مدینہ منورہ کی واپسی کا سبب بھی ایک چیستان ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ سرد موسم کی وجہ سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اسلئے ازراہ ترحم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت رخصت دیدی۔ پھر یہ بھی خیال ہے کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے موحدانہ خیالات پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا وہ بھی واپسی کا سبب ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مدینہ منورہ پہنچ کر شاہ اسمٰعیل نے گل افشانی کی تھی کہ شد رحال کی حدیث کے مطابق مسجد نبوی کے لئے سفر جائز ہے۔ اسلئے میں صرف مسجد نبوی میں نماز پڑھنے آیا ہوں۔ رسول پاک کے مزار اطہر کی زیارت ضمناً حاصل ہو گئی۔ ان امور کی وجہ سے مدینہ والے ان صاحبان سے الفت نہیں برت سکتے تھے۔ وہ ان کے درپئے آزار ہو گئے۔ اور خیریت اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو آئیں (تحفۂ محمدیہ ص۱۲۶)۔ اگر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صحیح ہے تو انہیں عقائد کی وجہ سے انہیں خارج البلد کرنے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے مقدمہ اور شاہ اسمٰعیل کے شد رحال والے اعلان نے مکہ معظمہ والوں کے کان نہ کھولے ہوں۔ اور ابتدائی افواہوں کی وجہ سے جو انہوں نے غلط تاویل کرکے مطمئن کیا تھا

ان کی فریب دہی کو نہ سمجھ لیا ہو۔ مکہ معظمہ کے اس آخری قیام میں یہاں کچھ تغیر
نظر آتے ہیں۔ پہلے کا سا جوش اور کرامتوں کا مینہ نہیں معلوم ہوتا۔ تبلیغ و اشاعت
کرامات اور سلسلہ بیعت کے بجائے اب حج و عمرہ اور عبادت کا غلبہ ہے۔ یہی خلوت
گزینی اور اچانک واپسی ظاہر کرتی ہے کہ تبلیغ کو چھوڑ دینا معنی دارد کہ در
گفتن نمی آید۔ اگر واپسی کے لئے فرمان الٰہی ہو چکا تھا تو یہ فرض تھا کہ انہیں
دوسرے حج سے محروم کرنا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سابق کی نسبت مہذب بھی
نہیں ہوتے اور یہ اللہ کا کرم خاص ہے کہ مکہ والوں نے غصہ و عتاب سے نہیں
نہ جانے کا موقع دیا۔ حکم الٰہی ۱۵ شوال کو ہوا تھا اور دونوں سے ذیقعدہ کی آخر تک ایک
ماہ تک سرزمین حجاز کو یاد نہ کر دن الوداع کہا۔ پندرہ دن کے اندر اتنے بڑے قافلہ کو
جہازوں کا مہیا ہو جانا بھی ایک کرامت ہے مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ
کی واپسی کے بعد قافلے والوں کو جہازوں کی گنجائش کے مطابق بھیجنا شروع کر
دیا تھا۔ اس صورت میں حکم الٰہی کا تعین ۱۵ شوال غلط ٹھیرتا ہے۔ آخر یہ ماننا پڑتا
ہے کہ بات بنائے نہیں بنتی۔ شاہ اسمٰعیل کی زبان سے صاحبزادی زینب کے علاوہ جن
موت میں مرید کرنا بھی ایک معمہ ہے۔ مولوی معین الدین صاحب بھتیجے جو بیمار ہونے کی
وجہ سے مکہ معظمہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے دن سید
صاحب نے مدینہ منورہ میں بتایا کہ آج سید معین الدین کا انتقال ہو گیا اور ان کا
ذکر ملاءِ اعلیٰ میں ہو رہا ہے (سوانح احمدی)۔ اب تجربہ تہہ میں یہ حقیقت ہے کہ
شاہ عبدالعزیزؒ کا جب وصال ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء میں ہوا تو سید صاحب کو مطلق خبر نہیں
ہوئی۔ اور ملاءِ اعلیٰ میں ان کا ذکر انہوں نے نہیں سنا اور نہ ان کے وصال کے
بعد سید صاحب نے اپنے پیر و مرشد کا کبھی ذکر کیا۔ البتہ شاہ اسمٰعیل اور مولانا
عبدالحی بڑی تاخیر کے بعد سنہ ۱۲۴۰ھ میں دہلی پہنچے تھے رسم تعزیت ادا کرنے کے

سابقہ عقائد کے متعلق مسجد جامع میں مباحثہ بھی کیا۔ ان واقعات کو سن کر اور حالات معلوم کر کے کہنا پڑتا ہے کہ شئے لطیف کی کمی یا ادھر ہے یا اُدھر ہے۔ اور بات طے نہیں ہوتی۔ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں۔ اس سفر حجاز کا مبشرات سے سلسلہ ملانا ہر عامی کا کام نہیں۔ بادی النظر میں حال قال سے جُدا معلوم ہوتا ہے۔ سورہ بقرکی آیت نمبر ۱۹۷ کا مفہوم یہ ہے کہ حج میں رفث فسوق اور جدال نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر یہاں یہ سب کچھ ہوا۔ ایسی حالت میں اس سفر حجاز کو وسیلہ ظفر کوئی کیسے مان سکتا ہے ؎

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

---

(۷)

سیاسی ماحول

بہر لحظہ بہر ساعت بہر دم
دگرگوں مے شود احوال عالم

دنیا جانتی ہے کہ سلطنت مغلیہ انگلشیہ کس طرح بن گئی۔ آخری تاجداران مغلیہ کی غفلت و عیش پسندی کا مرثیہ اور انگریز سوداگروں کی فتح مندی کا قصیدہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں۔ مگر کچھ ایسی تو بدقسمتی ہے کہ کسی نے حقیقت واقعی کی طرف توجہ نہیں کی۔ انگریز سوداگروں کے عروج کی داستانوں میں خود ایسا سوز موجود ہے کہ سینہ کوبی کو جی چاہتا ہے اور خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ داروں نے خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ مگر یہ خود مختاری راس نہیں آئی۔ جنوبی، وسطی و شمالی صوبہ داروں کی زندگی بجلیوں کے سایہ میں گذری شمالی حملوں اور جنوب میں جاٹوں اور مرہٹوں نے قیامت برپا کر دی مگر مشرق میں بنگال چین سے بیٹھا ہوا دولت کے انبار لگا رہا تھا۔ دیوان بنگال مرشد قلی خان کے سامنے انگریز سوداگر سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس نے ۱۷۱۷ء کے معاہدہ کے ذریعہ انہیں جکڑ بند کر رکھا تھا۔ وہ قلعہ کلکتہ یعنی فورٹ ولیم سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے اس کے بعد علی وردی خان کی نوابی کے حضور میں بھی وہ دم نہیں مار سکتے تھے۔ مگر ۱۷۵۶ء میں جب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انہوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ یہ جرأت یوں ہوئی کہ پرتگال اور فرانس والوں کی طرح وہ بھی ملکی سیاست میں حصہ لے کر دولت کمانا چاہتے تھے اب یہ افواہ کہ سراج الدولہ

ناتجربہ کار، نااہل، رنگیلا اور ناعاقبت اندیش تھا کوئی معنی نہیں رکھ سکتی۔ جنگ
فرانسیسی اور ڈچ فوجیں اکھٹی کرتے تھے۔ ریاستوں کی فوجوں کو تعلیم دیا کرتے تھے
اور حکومتوں کی خانہ جنگیوں میں کسی نہ کسی فریق کے ممد و معاون بن کر معاوضہ و منافع
حاصل کیا کرتے تھے۔ اب انگریز سوداگروں کو بھی طمع اور ہوس پیدا ہوئی۔

فاتح ہند اور ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کا بانی کلایو کو مانا جاتا ہے
وہ انگلستان کے آوارہ گرد نوجوانوں میں سے تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت
کر کے اس کا ہندوستان میں آنا ۱۷۴۴ء میں تھا۔ کئی برس کے بعد نظام اور نواب ارکاٹ کی جنگ ہوئی۔ تو
فرانسیسی سردار ڈوپلے نے ناصر جنگ کی حمایت کی، اور دو ہزار انگریزوں کا کلایو محمد علی کی طرف سے نمودار ہوا
۱۷۵۱ء[1] کی اس جنگ میں ڈوپلے نے کلایو سے منہ کی کھائی اور کلایو کی بہادری سے محمد علی کی ریاست
ارکاٹ ہر خطرے سے محفوظ ہو گئی۔ اسکے بعد کلایو کی قسمت میں بنگال کی فتح لکھی ہوئی تھی اسی لئے وہ سلطنت
انگلشیہ کا بانی بن گیا۔ حالانکہ سوائے سیم و زر کی طمع کے اس کا کوئی اور تصور و مقصد نہیں تھا۔
اپنا کام ختم کر کے وہ اپنے وطن چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے کارناموں
کے نتائج کی وجہ سے ایسا فتنہ اٹھا کہ انگریزی سوداگروں کو جان بچانا مشکل ہو گئی
لہذا اس فتنہ و فساد کے فرو کرنے کیلئے ۱۷۶۵ء میں وہ پھر بھیجا گیا۔ لیکن بیمار ہو جانے
کی وجہ سے ۱۷۶۷ء[2] میں انگلستان جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ پہلی مرتبہ جب وہ وطن
پہنچا ہے تو اس آوارہ گرد نوجوان کی آمدنی مستقل طور پر چالیس ہزار پونڈ سالانہ
کی ہو گئی تھی۔ اور وہ اپنے ساتھ اعزا و اقربا کے لئے پچاس ہزار پونڈ کی رقم لیکر
گیا تھا۔ اس کا استقبال شاندار طور سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ کیا گیا۔ اسکی دولت
کی فراوانی کا علم عوام کو ہی نہیں بلکہ ڈائرکٹروں کو بھی تھا۔ اسی لحاظ سے کمپنی کے

---

1. HISTORY OF ENGLAND IN THE 18th CENTURY VOL PAGE 263
2. MULLER NELSON HISTORY OF INDIA 5TH EDTION PAGE 279

دوسرے افسروں کی دولتمندی کا بھی اندازہ لگا لیا گیا۔ لہذا اس نتیجہ پر پہنچ کر کہ ہندوستان میں دولت آسانی سے مل جاتی ہے۔ انگلستان والوں نے جتنے بیکار و مجہول لڑکوں کو بھی کمپنی کا ملازم کروا دیا[1]۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلایو کامیاب ہو کر انگلستان جانا ہوا تو کمپنی کے ملازمین نے اس کی بے ایمانیوں اور رشوت ستانیوں کی شکایت کی تحقیق کے لئے کمیٹی بٹھا دی گئی جس نے عرصہ دراز کے بعد فیصلہ دیا کہ شکایت ثابت نہیں ہے۔ مگر دل کے چوٹ بھاری و پریشانی نے اس درجہ اضافہ کیا کہ بیزار ہو کر بانی سلطنت انگلشیہ ہند نے ۱۷۷۴ء میں خودکشی کر کے تمام بلاؤں سے نجات پائی۔ کیتھ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ

"کلایو نے کمپنی کو بدنام و ذلیل کر دیا۔"

انگریز سوداگروں کی داستان کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ جب بنگال میں انگریز سوداگروں کو روپیہ کمانے کا سودا سوار ہوا تو سب سے پہلی حرکت یہ کی کہ نذرانہ وغیرہ لیکر کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سراج الدولہ کے مجرموں کو پناہ دینے لگے سراج الدولہ نے جواب طلب کیا۔ تو ان بہادروں کو بجز معافی مانگنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر معافی حاصل کرنے کے بعد ان خطا کاروں نے ۱۷۵۶ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے مرمت کے بہانے فورٹ ولیم کو وسیع کرنا شروع کیا تاکہ اپنے آپ کو اور زیادہ محفوظ کریں۔ اور مجرموں کو چھپانے میں آسانی ہو۔ سراج الدولہ نے پھر جواب طلب کیا اور صاحب بہادروں نے ندامت کا اظہار کر کے اقرار کیا کہ اب ایسی خطا قابل معافی نہ ہوگی۔ سراج الدولہ کچھ سہی مگر مروت کا آدمی تھا۔ اس نے اعتبار کر لیا اور درگذر کی۔ مگر یہ باز آنے والے نہ تھے۔ اس مرتبہ اپنی تعداد کی تعداد ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے اپنی فوج میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے معنی تھے کہ "آ بیل مجھے مار"۔ اب نواب نے ایک نہ سنی اور فوج کشی کر کے نہ صرف قاسم بازار کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ بلکہ

---

[1] A.B. KEITH - A CONSTITUTIONAL HISTORY OF INDIA 2D EDITION 1937 PAGE

فورٹ ولیم کو فتح کرکے ان مکاروں کو بھگا دیا۔ اس میں مورخین نے سراج الدولہ کو حق پر سمجھا ہے اور اس کے حملہ کو کسی نے بھی ناجائز نہیں کہا۔ اس معرکہ میں چند انگریز گرفتار ہوئے تھے انہیں مفتوحہ فورٹ ولیم کی ایک کوٹھڑی میں مقید کر دیا گیا تھا۔ ہونے والی بات کہ کافی ہوا کا گذر نہ ہونے کی وجہ سے کچھ قیدی دم توڑ گئے۔ انگریز مورخین نے بلیک ہول کی اصطلاح ایجاد کرکے عجیب روح فرسا داستان گڑھی اور نواب کو مطعون کرکے ساری دنیا کے دماغ سے یہ خیال محو کر دیا۔ کہ ان قیدیوں کو محبوس کرنے کے بجائے قتل کرنے کا اسے پورا حق حاصل تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد فورٹ ولیم کو واپس لینے کے لئے مدراس سے کمک آئی۔ بحری فوج کا میر مسٹر واٹسن تھا۔ اور بری فوج کی قیادت کلایو کے سپرد تھی۔ کلایو کے قدم پہلی مرتبہ بنگال میں اسی وقت آئے تھے۔ بحری حملہ کی مدافعت سراج الدولہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا انگریزی افواج نے کلکتہ کو تسخیر کرکے ۲ جنوری کو ۱۷۵۷ء کو ہگلی بھی فتح کر لیا۔ صلح ہو جانے پر نواب کو فورٹ ولیم اور ہرجہ دینا پڑا۔ اس کے بعد کامیابی پر نازاں ہو کر انگریزوں نے چندر نگر کا رخ کیا۔ نواب نے فرانس والوں سے مدد لے کر مدافعت کی۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔ اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور پھر دوبارہ صلح ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ابدالی نے پنجاب پر تاخت کی تھی۔ کلایو کی آنکھوں میں نواب خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اب کلایو کو نئی سوجھی۔ اتفاق سے ایک سکھ تاجر امی چند کلایو سے مشورہ کرنے کے لئے آیا۔ کہ نواب سے اپنا قرضہ کس طرح وصول کروں۔ کلایو نے جواب دیا کہ میر جعفر کو میرا طرفدار بنا دو تو تمہارا قرضہ ادا کر دونگا اور جعفر کو نواب کی گدی دلوا دونگا۔ جب یہ تدبیر مکمل ہو گئی تو جھوٹے بہانہ بنایا۔ سراج الدولہ کو الٹی میٹم دیا کہ گذشتہ معاہدہ کی خلاف ورزی جو آپ سے سرزد ہو رہی ہے

ہے وہ گوارہ نہیں کی جاسکتی۔ نواب ابھی جواب نہیں دے پایا تھا کہ پلاسی پہنچ کر کلایو نے حملہ کر دیا۔ میر جعفر نے سازش کے مطابق سکوت اختیار کیا اور سراج الدولہ کو گرفتار کر کے کچھ عرصہ بعد شہید کر دیا گیا۔ پلاسی کی یہ جنگ ۲۳۔ جون ۱۷۵۷ء کو ہوئی تھی۔ معاہدہ کے وقت امی چند نے قرضہ کی ادائیگی کی شرط لکھنے کے لئے اصرار کیا۔ کلایو کے تکلف کو دیکھ کر اس نے دھمکی دی کہ سازش کا راز افشا کر کے پانسہ پلٹ دوں گا لہذا کلایو نے دو معاہدے لکھوائے۔ ایک میں قرضہ والی شرط مذکور تھی۔ اور دوسرے میں نہیں تھی۔ پہلی کاپی دکھا کر امی چند کو مطمئن کر دیا۔ مگر دوسری کاپی پر دستخط کروائے جس میں قرضہ کا ذکر نہیں تھا۔ معاہدہ بغیر واٹسن کے دستخطوں کے مکمل نہیں ہو سکتا تھا اور اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ بلا اس کے معاہدہ کو وہ غلط سمجھتا تھا۔ مگر کلایو نے واٹسن کو اطلاع کئے بغیر اس کی لاعلمی میں خود اپنے ہاتھ سے اس کے دستخط بنا دیئے۔ کلایو کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے سلطنت انگلشیہ کی بنیاد پڑی۔ میر جعفر نے نوابی کی خوشی میں ملازمین و ممبران کونسل کو دس لاکھ کا انعام دیا۔ اور کمپنی کے نام چوبیس پرگنہ کا علاقہ لکھ دیا۔ مگر یہ علاقہ کلایو کی جاگیر کے نام سے مشہور ہوا[۱]۔

پلاسی کی فتح کے بعد انگریز سوداگر اپنے آپ کو حاکم سمجھنے لگے۔ ان کی نظر میں حکومت کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقہ سے روپیہ وصول کرنا تھا چنانچہ خوب نذرانے لئے۔ ڈٹ کر جرمانے کئے۔ زبردستی لوٹ مار کی اور پھر ضرورتمندوں کو حد سے زیادہ شرح سود پر قرضے دیئے۔ ان حرکات ناشائستہ کی وجہ سے لوگ تھرتھرانے لگے۔ انگریز کی صورت دیکھ کر گاؤں والے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ جاتے تھے۔ دکانیں بند ہو جاتی تھیں۔ اور راہگیر بدحواس ہو کر رہ جاتے تھے[۱]۔

---

1. Lecky: A history of England in the 18th century VOL IX Page 264.

میر جعفر کے نواب ہو جانے کی خبر سن کر دہلی کا شہزادہ نواب وزیر اودھ کی معیت میں حملہ آور ہوا۔ مگر کلایو کا نام سنتے ہی نواب اودھ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس مجبوری میں شاہزادے نے اپنے آپ کو کلایو کے حوالے کر دیا۔ مگر کلایو کی سمجھ بوجھ اور دور اندیشی قابل غور ہے۔ اس نے شہزادے کی تعظیم و تکریم دل کھول کر کی اور نذرانہ کے طور پر پانسو اشرفیاں پیش کیں۔ شاہزادہ ہنسی خوشی واپس چلا گیا۔ اب میر جعفر کو وہم پیدا ہوا کہ اس کا کروفر یا اس کی دولت لوٹ کر اسے ذلیل و برباد کر رہا ہے۔ لہذا نجات پانے کے لئے ڈچ سے سازش کی مگر اس مقابلہ میں کلایو کو فتح ہوئی اور اس نے پھر میر جعفر کو اپنی غلامی میں قبول کر کے بحال کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷۵۹ء کا ہے جس کے بعد ۱۷۶۰ء میں کلایو انگلینڈ واپس گیا

فتح پلاسی کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اب تک متعدد ایشیائی فاتحین نے ہندوستان پر تسلط جمایا تھا مگر اس قسم کی تبدیلی کبھی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ان فاتحین کا طرز زندگی اور طرز حکومت مفتوحین سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ مسلمان فاتحین کا مذہب اور ان کی زبان عربی یا فارسی اگرچہ مفتوحین سے ملتی جلتی نہیں تھی۔ مگر اس سے اجنبیت و غیریت نہیں پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے یہاں کی اقتصادیات، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو نقصان نہیں پہنچایا۔ قصبات کی زندگی کو بحال رکھا۔ ان کے یہاں سیاسی معاملات فاتح کے قبضہ میں رہے۔ اور نظمی و مالی معاملات میں ہندوستانیوں کو شریک کیا ہی نہیں بلکہ وہ ایسے گھل مل کر رہے کہ یہاں کے تمدن کو خود قبول کر لیا۔ بعض ہندو مصلح اگرچہ ذات پات کے خود مخالف تھے مگر مسلمانوں نے ان کے ذات پات اور رسم و رواج اپنے یہاں رائج کر لئے۔ اس کے برخلاف انگریزی راج میں ان کے اصول اس درجہ علیحدہ تھے کہ سوسائٹی میں

یکسانیت نہیں رہی اور زندگی کے ہر اصول اور شعبہ میں غیریت پیدا ہو گئی۔ فاتح و مفتوح میں بُعد ہونے کی وجہ سے جو اختلاف ہُوا وہ ہر طرف ملازمین کی دولت اندوزی سے خود کمپنی کو بے حد نقصان تھا۔ اور ان میں تفریق پیدا ہو گئی۔ ملازمین مالدار بن گئے اور کمپنی غربت و افلاس کی زد میں آ گئی۔ میر جعفر میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ بد نظمی کو دُور کرنے کیلئے ہر مرتبہ روپیہ مہیا کر سکے، لہٰذا بد امنی کا ملزم بنا کر اسے معزول کر دیا گیا۔ اور اس کے داماد میر قاسم کے سپرد نوابی کی گئی۔ اس صلہ میں میر قاسم کو بہت بڑی رقم اور چند اضلاع نذر کرنا پڑے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میر قاسم میں اپنے خسر سے زیادہ شئے لطیف تھی اس نے مرشد آباد کے بجائے مونگیر کو اپنی راجدھانی بنایا اور کمپنی کے ناجائز طریقوں پر کڑی نظر رکھی جس کی وجہ سے کمپنی کے ملازمین اور نواب کے گماشتوں میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ مئی ۱۷۶۲ء میں اس نے گورنر اور کونسل سے شکایت کی کہ کمپنی کے ملازمین ریاست میں فساد کرتے ہیں، لوٹ مار کرتے ہیں، گماشتوں کو زد و کوب کرتے ہیں، بازار سے چوتھائی قیمت پر اشیاء خریدتے ہیں۔ اور اپنا مال پانچ گنی قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ جب شنوائی نہیں ہوئی۔ تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیدیا کہ جہاں ملیں انگریزوں کو قتل کر دو۔ اس کے بعد شاہ عالم (۱۸۰۶-۱۷۵۹) اور نواب اودھ سے اُس نے سازش کی جس کا نتیجہ ہُوا کہ ۱۷۶۳ء میں اُسے معزول کر کے میر جعفر کو دوبارہ نوابی عطا کر دی گئی۔ مگر میر قاسم اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر ۱۷۶۴ء میں انگریزوں کے مقابل آیا۔ اس جنگ بکسر کی کامیابی نے انگریز سوداگروں کو مستقل طور پر بنگال کا مالک و حاکم بنا دیا۔ بوجہ علالت کلایو کو ۱۷۶۰ء میں ہندوستان چھوڑنا پڑا[1] اور اسی سال میر جعفر کا بھی انتقال ہو گیا ۔۔۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلائیو ہندوستان تشریف لائے تو حسب عادت

1. WOODRUF. PHILIP. THE MAN WHO RULED IN INDIA - THE FOUNDERS. PAGE 106.

اپنی حرفت سے کام چلایا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد کمپنی کے ملازمین نے ڈائرکٹروں
سے اُن کی رشوت ستانی اور لغویات کی شکایت کی، لہذا صاحب بہادر بیمار ہو
گئے۔ اور یہاں سے چلے گئے۔ شاہ عالم سے ۱۷۶۵ء میں دیوانی حقوق حاصل کر لینے
کے بعد سات برس تک خوب جبر و تشدد کیا گیا اور وہ عملی اصلاح کی کوئی صورت
نہ نکل سکی۔ پھر آسمانی غضب یہ ٹوٹا کہ ۱۷۶۹ء میں زبردست قحط پڑا جس کی وجہ سے
ایک تہائی آبادی جانبر نہ ہو سکی۔ اور ہزاروں بیگھہ زمین بنجر ہو کر رہ گئی[1]۔ رابرٹ
اور کینیفن نے اس قحط کے جانی نقصان کو بہت زیادہ لکھا ہے۔ اب کمپنی کی جان مصیبت
میں تھی۔ نہ آمدنی ہوئی نہ مصارف پورے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۶۷ء میں سترکار،
کمپنی کے منافع کی شرح جو چھ فی صدی سے دس فی صدی تک بڑھ گئی تھی۔ وہ اب
۱۷۷۲ء میں ساڑھے بارہ فیصدی تک پہنچ گئی۔ اس نقصان کو پورا کرنے کیلئے کمپنی
کو حکومت انگلستان سے دس لاکھ پونڈ قرض لینا پڑا۔ غرض انقلاب یوں آتے
ہیں اور قسمتیں یوں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ بہرحال کلائیو کو بانی سلطنت انگلشیہ کا
لقب ملنا تھا۔ وہ بغیر کسی حجت کے مل گیا۔

۱۷۷۲ء میں گورنر بنگال وارن ہیسٹنگز ہوا۔ اس نے اپنے ہندوستانی تجربہ اور
ذاتی فراست سے کلائیو کی حکمت عملیوں کو شرمندہ کر دیا۔ اخلاق و قانون اس کی نظر
میں بے معنی الفاظ تھے۔ نواب بنگال اور مغل بادشاہوں سے جو معاہدے تھے اس
نے سوخت کر دیئے۔ ۱۷۷۲ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ جو خرابیوں کو دور کرنے کیلئے بنایا
گیا تھا۔ اس کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے ناکام ہو کر ختم ہو گیا۔ دیسی عملہ کو اس نے
برطرف کر دیا۔ روہیلوں کو تباہ کر کے روہیل کھنڈ نواب اودھ کے سپرد کر دیا۔ نواب
سے روپیہ نہ ملنے پر جبر و تشدد کے ساتھ بیگمات اودھ سے روپیہ وصول کیا۔ مہاراجہ

---

1. MILLS HISTORY OF INDIA VOL V PAGE 376

بنارس سے کئی مرتبہ روپیہ وصول کیا مگر وہ جب نہ دے سکا، تو اُسے معزول کر دیا۔
اپنے مظالم سے ہندوستانیوں کو تباہ و ذلیل کیا۔ مگر کمپنی کی غربت کو دور کرنے کیلئے
اس نے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ لہذا سنہ ۱۷۷۴ء میں وہ گورنر جنرل بنا دیا گیا۔
زمینداری کا نیا بندوبست بنایا۔ مالگذاری وصول کرنے کے لئے کلکٹر کا عہدہ ایجاد
کیا۔ مگر باایں ہمہ کاشتکاروں اور زمینداروں میں حد درجہ اختلاف بڑھ گیا اور اس
سے کسی کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ رشوت ستانی اور منافع کے لئے راستے کھل گئے۔
سنہ ۱۷۷۲ سے سنہ ۱۷۹۳ تک حکام نے تہائی اراضی کا مالک اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ
بنیوں کو بنا دیا۔ لگان و مالگذاری ادا نہ ہونے پر جائدادیں نیلام ہوتی تھیں اور بنیے
روپیہ دے کر خرید لیتے تھے۔[1] مثال کے طور پر اس طرح ہسٹنگز نے اپنے ملازم خاص
کنتو کو بہت بڑی جائداد حاصل کر لینے کا موقع دیا۔[2] ہندوستانیوں کے مقدمات
فیصل کرنے کے لئے صدر دیوانی اور صدر نظامت کے محکمے قائم کئے جن سے مقدمہ
بازی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کی زیادتیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے کونسل کے
ممبروں نے اعتراض کئے تو سنہ ۱۷۸۵ میں اس نے استعفےٰ دیدیا اور بعد کو انگلستان
میں اسی وجہ سے مقدمات میں ماخوذ ہوا۔

لارڈ کارنوالس کا عہد، سنہ ۱۷۸۶-۹۳ء دانشمندی و بیوقوفی کا مجموعہ ہے، اسی
سال میں سید احمد شہید پیدا ہوئے، اس کی قابلیت میں کچھ شک نہیں۔ وہ نہ صرف
ہندوستانی رسم و رواج سے ناواقف تھا۔ بلکہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتا تھا اور
ان کا بہترین دشمن تھا۔ ان کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے انہیں نااہل بے ایمان
اور تنگ نظر سمجھتا تھا۔ اسلئے کہ وہ توہمات عجائبات اور خرافات کی پرستش

---

1. R.C. DUT PAGE 61.

2. COMMITTLE OF CIRCUITS MINUTES DATED SEP 15-1775

کرتے تھے۔ سر جان شور نے لکھا ہے کہ:۔[1]

"وہ ہندوستانیوں کی عزت و ناموس کو فنا کرنا چاہتا تھا۔ اور انہیں بیکار بنا کر اور [illegible] ذلیل کر کے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو عہدوں سے علیحدہ کر کے اپنے نالائق اور نکمے انگریزوں کو آسانیاں بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے استمراری بندوبست کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیلام کی کثرت کی وجہ سے ۱۸۱۲ء تک زمینداری بنیوں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ کاشتکار اس قدر پریشان ہوئے کہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس کی قانونی اصلاحات سے طویل مقدمہ بازی کا آغاز ہوا جرائم بڑھے۔ فساد پھیلا اور بد امنی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنی قوم کی برتری و فضیلت کا قائل تھا۔ انگریزوں کو اس قدر فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ ہندوستانیوں کو [illegible] سمجھا کرتے [illegible] کمپنی کے فوجی افسر اور وہ بدمعاش قسم کے تھے۔ اکثر دولت کمانے کے علاوہ [illegible] فرائض کا مطلق خیال نہیں تھا۔ ڈیوک آف [illegible] کا خط بنام کارنوالس [illegible] مسٹر ولبرٹ کی کتاب ان حقائق سے بھری ہوئی ہیں۔ ڈیوک آف ولنگٹن کی کتاب NARRATIVE OF MARQUES OF WELLISH GOVT OF INDIA ولیم میور اور مسٹر [illegible] سٹوکس کی کتاب THE ENGLISH UTILITARIAN & INDIA اور گلیگ کے MEMOIRS میں کارنوالس کی پیدا کردہ خرابیوں کی تفصیل مل سکتی ہے۔ کارنوالس نے جو اصلاحیں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہندوستانیوں کے خلاف جو قوانین بنائے وہی اس کی غیر مقبولیت کا باعث ہوئے۔ مگر اس نے گورنمنٹ کو مضبوط بنانے کے لئے جو خاکہ بنایا اگرچہ اس کے عہد میں ناکام ہوا۔ مگر آئندہ اسی پر عمل کر کے سرکار انگلشیہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے صرف دو اصول

1۔ NOTES ON INDIAN OFFAIRS VOL II PAGE 577-

2۔ RECORDS OF INDIAN FACTS VOL PAGE 107-

تھے یعنی انگریزی حکومت کا استحکام اور ہندوستانیوں کی آزادی کو ختم کرنا تاکہ وہ بغاوت نہ کرنے پائیں مگر اس کے اختیاری بندوبست سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو دولت جمع کرنے کے بعد حکومت کے لئے خطر ہوا۔ فوجداری اور عدالت ہائے انصاف کی علیحدگی کی وجہ سے افسروں کے اختیارات کم ہوگئے۔ اور گورنمنٹ کے وقار کو نقصان پہنچا۔

وارن ہیسٹنگز کے عہد سے کر ۱۷۹۳ء تک ہندوستانی اور انگریزوں میں میل جول رہے۔ اور قوموں میں امتیازات فرق نہ پیدا کر سکے۔ انگریزوں نے ہندوستانی رسم و رواج سیکھے اور میل جول کو باقی رکھا۔ ہیسٹنگز خود فارسی اور بنگالی زبان جانتا تھا۔ سر ولیم جونز سنسکرت کا ماہر تھا اور اس نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ انگریز ہندوستانی امراء و شرفاء کی محفلوں اور جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے انہیں اپنے مکانوں پر مدعو کرتے تھے ہاتھی کی لڑائیاں دیکھتے تھے۔ اور حقہ بھی پیتے تھے۔ بعض کے ہاں ناچ ہوتے تھے۔ بعض نے ہندوستانی عورتوں سے بیاہ کر لیا کرتے تھے۔ دو چار روپے ماہوار پر ہندوستانی رکھی جاتی تھیں۔ ہندوستانی شرفاء انگریزوں کی دعوتوں میں شریک ہوتے تھے انگریزی کھانے کھاتے تھے اور شراب پیتے تھے۔ مثلاً سور کا گوشت بھی کھانے لگے تھے اور اس کا نام انہوں نے ولایتی ہرن کا گوشت رکھا تھا۔ ہیسٹنگز کے خاص دوست چیت رام۔ اس کا بھائی لچھمن نراین گنگا گوبند سنگھ اور علی ابراہیم خان تھے۔ مگر کارنوالس کے زمانہ میں یہ سب باتیں متروک ہوگئیں۔ تفریق شروع ہوگئی۔ غیریت کے حجاب حائل ہوگئے اور خوش فہمیاں ختم ہوگئیں [1]۔

ویلزلی (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) دیسی ریاستوں کو ختم کرنے کے درپے تھا انگریزوں

1. T.G. SPEAR THE NOBIES PAGE 131.

کی ہدایات کی پرواہ نہ کرکے اس نے ریاستوں میں امدادی طریقہ جب ری کیا کہ فرانسیسی و پرتگالی علیحدہ کر دیئے جائیں۔ ان کے بجائے انگریزی فوج اپنے خرچ پر رکھی جائے۔ ٹیپو نے انگریزی فوج اپنے یہاں رکھنے سے انکار کر دیا۔ تو اس کے خلاف ۱۷۹۹ء میں جنگ شروع کی۔ وزیر میر صادق کی سازش سے سلطان ٹیپو شہید ہوا۔ سب ریاستوں پر قابو پالینے کے بعد مرہٹے رہ گئے تھے۔ لہذا جنرل لیک نے شمالی ہند کی طرف کوچ کیا۔ کرنل ویلزلی (ڈیوک آف ولنگٹن) اور سٹیونس دکن کی طرف روانہ ہوئے جنہوں نے سندھیا اور بھونسلا کو شکست دی جنرل لیک نے علی گڑھ کا قلعہ لیا۔ دہلی پر حملہ کیا۔ آگرہ فتح کیا۔ شاہ دہلی کی پنشن مقرر کر دی گئی اور اس کی حکومت قلعہ کے اندر رہ گئی۔ ویلزلی سے ڈائرکٹر خوش نہ تھے۔ اس لئے ۱۸۰۵ء میں اس نے استعفےٰ دیدیا۔ پھر انگلستان میں اس پر بڑی بوچھاڑ ہوئی۔ ناخوشی کی وجہ یہ تھی کہ برٹش حکومت کے استحکام کے ساتھ وہ عوام کو قعر مذلت سے نکال کر خوش حال بنانا چاہتا تھا۔

لارڈ منٹو (۱۸۱۳-۱۸۰۷) کا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرکے دوستی کی۔ اور کابل و ایران کو سفارت بھیجی کہ یورپ کی کسی حکومت کو اپنے ملک سے ادھر آنے کا راستہ نہ دیا جائے۔ ۱۸۱۳ء میں لارڈ موئرا یعنی لارڈ ہیسٹنگز نے مغل بادشاہ اکبر ثانی (۱۸۳۷-۱۸۰۶) کو نذرانہ دینا بند کر دیا۔ اور اکبر ثانی سے اختیارات چھین لئے۔ اسی سال انگریزی تعلیم شروع ہوئی مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ مگر شاہ عبدالعزیزؒ نے جب فتویٰ دیدیا تو استفادہ کرنے لگے۔

لارڈ ہیسٹنگز (۲۳-۱۸۱۳ء) کے آنے پر یہاں غدر مچا ہوا تھا۔ اور ریاستوں میں جھگڑے ہو رہے تھے۔ اس نے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ویلزلی کے طرز عمل سے جو فتنہ اٹھا ہے اس کو دفع کرنے کے لئے مجھے اختیار دیا جائے چنانچہ گورکھوں کو اس نے

۱۸۰۶ء میں زیر کیا۔ اس کے بعد بمبئی اور مدراس سے فوجیں منگا کر پنڈاریوں کو محصور کر لیا۔ پنڈاری حکومت نہیں چاہتے تھے۔ صرف لوٹ مار کے عادی تھے۔ اور معاوضے کر مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑے تھے۔ ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں میدان صاف کر کے امیر خان کو ریاست ٹونک دی۔ کریم خان کو گورکھپور میں ریاست ملی۔ مگر چیتو فرار ہوگیا۔ اور چیتے کا شکار ہوگیا۔ ۱۸۱۸ء تک مرہٹوں سے فیصلہ کیا۔ ۱۸۲۳ء تک ہندوستان پر تسلط ہوگیا۔ اس سال ڈائرکٹروں کو ناراض دیکھ کر بجائے استعفیٰ دے وطن چلا گیا۔

۱۸۳۱ء میں لارڈ بینٹنک نے رنجیت سنگھ سے دائمی صلح کا معاہدہ کیا اور شاہ عالم کو قلعہ سے ہٹا کر قطب مینار کے محلوں میں بھیج دیا۔ بہادر شاہ (۱۸۳۷ ۵۷) کے بعد لارڈ کیننگ نے مغلوں کی فرضی بادشاہی بھی ختم کر دی اور ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا۔ کارنوالس نے بڑے عہدوں سے ہندوستانیوں کو محروم کر دیا تھا جس کی وجہ سے بدامنی ہوئی۔ ویلزلی نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا کہ یہ قانونی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے محکوموں میں ہر دلعزیزی حاصل نہیں کی جا سکتی لہٰذا ان کے قلوب سے نفرت و مخالفت کو دور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے ان کے اختیار، آمدنی اور عزت چھین کر ابھی تک ان کے زخموں کا مداوا نہیں کیا ہے۔ (مکتوب ویلزلی مورخہ ۲۲ اپریل ۱۸۰۴ء) جو تامسن اور گیرٹ نے اپنی کتاب The rise and fulfilment of British rule in India [1] میں درج کیا ہے۔ منرو نے اپنی رپورٹ ۱۲ اگست ۱۸۱۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کو لکھا کہ برٹش گورنمنٹ کی فوجی قوت بغاوت کو دفع کر سکتی ہے۔ بیرونی حملوں کا تدارک کر سکتی ہے۔ اور رعایا کی حفاظت کی ضامن ہو سکتی ہے جو کسی نیٹو ریاست سے ممکن نہیں۔ قانون و اصول اُن کی خانگی معاملات کی

۱۔ Cambridge short history of India.

بھی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ قوت و طاقت بڑی قیمت پر خریدی گئی ہے یعنی اپنے نیشنل کیریکٹر کی آزادی کو فنا کر کے۔ اسلئے اس قوت کو معزز و وقیع نہیں سمجھا جا سکتا۔ برٹش صوبوں کے باشندے بغیر کسی خوف کے، اپنے اپنے پیشوں میں مصروف رہ سکتے ہیں اور محنت کے پھل پا سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس وحشیانہ حالت میں رہ کر ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کا مستقبل کچھ نہیں ہے۔ قانون سازی میں ان کا دخل نہیں ہے۔ نہ ان کا کوئی حصہ فوجی و سول ملازمتوں میں ہے وہ محض حاکموں کے حکم کے بندے ہیں۔ لیکن جہاں کوئی حاکم نہیں ہے وہاں انکی جماعت میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو رہبری کر سکے۔ یہ لوگ پسماندہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اخلاق میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لہذا برٹش کی فتح و کامیابی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کے یہ لوگ مردہ دل ہو کر رہ جائیں گے۔ اسکے بعد ۱۲۔ نومبر ۱۸۲۱ء کو پھر لکھا کہ بیرونی فاتحین نے ہندوستانیوں پر سختی کی بلکہ ظلم بھی کئے۔ لیکن ان فاتحین کے برتاؤ سے ہمارا برتاؤ سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔

یہ نہ صرف نامہربانی نہیں ہے، بلکہ سیاست سے بھی بعید ہے کہ ان لوگوں سے کیریکٹر جو ہم سے دست نگر ہیں۔ ہمت زیادہ گر دیں۔ پھر چند برس کے بعد اس سے بھی زیادہ سخت لکھا۔ الفنسٹون نے لکھا ہے کہ ہم نے ان کے ذہن کو خشک کر دیا ہے اور ہماری فتوحات نے انہیں مردہ بنا دیا ہے۔ اب ان میں نہ علم رہ سکتا ہے۔ نہ ان میں کوئی مجتہد پیدا ہو سکتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اپنے پہلے والے پیشواؤں کو بھی بھول جائیں گے۔ مرہٹوں کی جنگ کے آخر میں میلکم نے بھی لکھا ہے کہ ہمارے قانون و آئین بغاوت آفرین ہیں، کیونکہ یہاں والوں کے سامنے ان کی موت کھڑی ہے۔ ہمارا سلوک اگرچہ صحیح ہے مگر سخت و سرد ہے۔ اس سے خوف پیدا نہیں ہوتا، مگر خوف کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ لوگ اگرچہ محفوظ ہیں، مگر بیکار و نادار ہیں اور ان سے کوئی

REGENOL REYHOLD :- THE WHITE SAHIES OF INDIA.

ہمدردی نہیں کی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں جان کی امان حاصل ہے مگر ان کی عزت
وناموس خطرے میں ہے اور ترقی کے مواقع نہیں ہیں جس کی آزادی سلب کر لی گئی
ہے۔ اس کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں، اور قومی غیرت کا پاس جاتا رہتا ہے۔ انکے گلے
میں طوقِ غلامی ڈال دیا گیا ہے۔ ہر فرقہ گرد ہے۔ سانس لینا دشوار ہے۔ جن دو
دو مسلمانوں کی جاگیریں ختم کر دی گئی ہیں ان کے اسلحہ ضبط کرلئے گئے ہیں یہ بہت
سے برطرف کردیئے گئے ہیں اور ان کی سرپرستی و حمایت ترک کرکے انکی قوم کو
کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ رہا عام طبقہ تو اس پیشے میں آ ڈٹے ہیں سختی سے
مالگذاری وصول کی جاتی ہے۔ کسانوں کی زندگی حرام ہوگئی ہے اور غلط طرف
گورنمنٹ کی پالیسی کی وجہ سے زمین کے کاشتکار معلوم ہوتے ہیں اس مایوس
کن حالات اور زمانہ کا تقاضا ہے کہ ان کے سدھارنے کے لئے نیا عنصر پیدا ہو
اور وہ حکومت کا تختہ اُتار دے۔[1]

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں
بھی کسی طرح سے کچھ ایسے ہی گزارشات کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:-

"اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ ہر پڑھے لکھے شدید الزام عائد
کرتے ہیں..... وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھیراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی
باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے .. وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے
مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزاروں خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے
..... ان کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض ادا کرنے کے حق چھین
لئے ہیں، اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا ہے
ہمارا بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے ان کے

---

1. THOMSON EDWARD THE MAKING OF INDIAN PRINCES.

تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی شکایتیں ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں.... وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولتوں سے گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا ـــــ ہنٹر صاحب ہی مسٹر بیلے حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کے سیکرٹری کی رائے نقل کرتے ہیں کہ :۔

"کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ (مسلمان) اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو کتنا ہی اچھا ہو ان کے ملی رجحانات کے خلاف ہے۔ ان کی ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں یہ طرز تعلیم ان کے مفاد کے خلاف اور ان کی مدنی روایات کے منافی ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان.... حکومت کے ان عہدوں اور ملازمتوں پر کوئی جگہ نہیں پاتے جن پر ان کی اجارہ داری قائم تھی.... جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی ہے وہ بھی نالاں ہیں۔ ان کا یہ احساس ایذارسانی تک نہیں پہنچا مگر ان کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپرواہی تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ انکے تعصب کو.... یہاں تک برانگیختہ کیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا جاہل اور متعصب باغی کی شکل اختیار نہ کرلے.... لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں تک کسی نے بھی مسلمانوں کے متعلق ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا.... ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ.... اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ اسکو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے۔ آج نانِ جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ نتیجہ ہے۔ ان کے اپنے انحطاط کا۔ عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا۔ ان کا انحطاط بھی ہماری

ہی سیاسی غفلت ولاپرواہی سے ہوا ہے۔ جبتک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا وہ ایسا ہی کھانا کھاتے، اور جملہ ضروریات زندگی میں ویسی ہی بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں۔ وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس قومیت اور جنگی اولو العزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت نے تباہ کر دیا ہے ..... انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں ان کیلئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہیئے کہ یہ قوم وہ ہے جس کی روایات شاندار ہیں، مگر جس کا مستقبل کچھ نہیں ہے ... دنیا کی بے ثباتی بھی ایا عجیب ہے کہ جو بڑے مضبوطی سے قوم کی جاتی وہی تباہ ہو جاتی ہے .. رجو نقل مکانی کرتی رہتی ہے اس کو ثبات و دوام ہے . ان تبدیلیوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں۔ جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہوا۔ اس سے مسلمانوں کا سب کاروبار ہمارے ہاتھ میں آ گیا۔ مسلمان حکمرانوں کو سخت نقصان پہنچایا..... وغیرہ وغیرہ۔

مگر افسوس کہ ہندوستان میں کسی کو بھی ہمت نہیں ہوتی کہ اپنی زبوں حالی کو سرکار والا جاہ کے سامنے پیش کرکے دادخواہی کرتا۔ البتہ دور بیٹھے ہوئے غم و غصہ میں بغیر اسباب کے گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا گیا اور یہ تجاویز ایسی تھیں کہ باوجود صحیح اور جائز ہونے عوام کے موافق نہ آ سکیں، اور کیوں آتیں جبکہ ان کی بیماری دور کرکے روح کو قوی نہیں بنایا گیا۔ مگر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی یہی کوشش تھی کہ پہلے قوت اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور جب ایسا کر لیا جائے تو جہاد کی تیاری کی جائے۔ ان کے بعد جو جہاد کیا گیا وہ طفلانہ جہاد تھا۔ اور جملہ عیوب سے بھرا ہوا تھا اور بغیر سیاسی حالات

کو سمجھے ہوئے محض مذہب کے نام سے کیا گیا تھا۔ آخر میں سرسید احمد خاں نے ہنٹر کی پیدا کردہ نفرت کو دور کر کے گورنمنٹ کے سہارے مدرسہ جاری کیا کہ مسلمانوں میں روح پیدا ہو۔ مگر دیوبند کے بعض علماء نے سرسید کی مخالفت کو عین مذہب سمجھا کہ کافر گورنمنٹ سے مدد کیوں لی۔ مگر آج دیوبند سرکار کی مدح سرائی میں اس درجہ منہمک ہے کہ ایسے اپنے اتحاد کا مطلق خیال نہیں اور اس میں بھی مختلف جماعتیں پیدا ہو گئیں ہیں مطلب یہ کہ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

گورنمنٹ برطانیہ کی ایک معزز ہستی نے جو کرنل ولزلی لوڈیوک آف ویلنگٹن کے نام سے شہرۂ آفاق ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"برٹش حکومت تلوار کے زور سے قائم ہوئی ہے اور ثبوت یہ دیا ہے کہ جتنے بھی حاکم ہوئے ان میں زیادہ تر سپاہی اور فوجی تھے۔ مثلاً کارنوالس ہیسٹنگز، ہارڈنگ۔ ڈلہوزی۔ ہیسٹنگ۔ آکلینڈ اور الن برو وغیرہ۔ مگر وہ بیانات جو ان صفحات میں مذکور ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کو انگلشیہ مکاری اور کیادی سے بڑھایا گیا ہے۔ پھر یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جان کر یا بے خبری میں اس انتقال حکومت کا سہرا شاہ اسمٰعیل کے سر ہے۔ جنہوں نے کہ قبل از وقت جہاد کا رخ انگریز کی طرف سے پھیر کر سکھوں کی طرف کر دیا اور اگر وہ اپنی رائے میں حق بجانب تھے تو رنجیت سنگھ نے بذریعہ سفارت صلح کی جب پیش کش کی تھی تو وہ صلح کر لیتے اور اس سے مل کر انگریزوں پر حملہ کرتے۔ بہرحال ان کے اس کارنامہ نے بہ احسن وہ کام کیا جو میر جعفر اور میر صادق سے نہ ہو سکا اور مزید یہ کہ شاہ اسمٰعیل نے مسلمانوں میں ایسی فرقہ بندی پیدا کر دی جس سے توحید کی علانیہ توہین ہو گئی۔ ان کی توہینیں پڑھ سن کر کوئی ذی ہوش اور صاحب تہذیب اسکو گوارہ نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ گذشتہ سے سبق لے کر حال کو درست کر کے مستقبل

کو سنبھالنے کی فکر کی جائے کہ مقصد توحید کی تکمیل ہو سکے۔ اختلاف رائے اور اختلاف عقائد ذاتی معاملات ہیں۔ ان سے اصلی مقصد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ان اختلافات کو بجائے زحمت کے رحمت بن جانا چاہیئے۔ یہ فساد پیدا کرنے والے اگرچہ توحید کے داعی ہیں مگر درحقیقت دشمن توحید ہیں۔ یہ لوگ توحید کے معنی علم معقول کے ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اپنی استدلالیوں جو جن و اہداف نفس دلیل [illegible] میں مبتلا ہیں اور اتحاد، غلط طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ توحید کا مفہوم صحیح جذبات و احساسات کی معرفت پر خلوص عمل سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اغراض و نفسانیت کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس تحریک میں نفاق و افتراق کا شائبہ موجود ہو وہ پروان نہیں چڑھ سکتی اور اتحاد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

[illegible]

---

(۸)

جہاد

لوگ زمان و مکان پر غور نہیں کیا کرتے جب ہی تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور بحثیں ہونے لگتی ہیں۔ بغیر ان دونوں کا تصور کئے ہوئے ہر مقصد بیکار ہے اور ہر بات ناقص ہے۔ جناب نواب امروہوی کا شعر ہے۔

ہر زمانہ کا اک فسانہ ہے
ہر فسانہ کا اک زمانہ ہے

اور مکان کے متعلق مولانا حالی نے بتایا ہے ؎

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

مقصد اور نصب العین اپنی جگہ مستقل طور پر قائم رہتا ہے مگر وقت و مقام کی وجہ سے اس کے حصول کے اشکال بدل جاتے ہیں۔ وہی بات شمال میں ایک طریقہ سے حاصل ہوتی ہے اور جنوب میں دوسرے انداز سے۔ زمین والوں سے ہوائی قلاباز اور دریائی غوطہ خور کا رنگ روپ مختلف ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جنگوں میں تیر و تفنگ اور تیغ سے کام لیا جاتا تھا۔ آج ان کی جگہ توپ، ٹینک اور ایٹمی اسلحہ نے لے لی ہے۔ موجودہ دور میں انجینروں اور معماروں نے رہنے کے لئے سُبک اور خوبصورت مکان بنائے ہیں۔ مگر پہلے والے محلوں کی بنیادیں سنگین ہوتی تھیں اور دیواریں لحیم شحیم قلعوں کی مانند تھیں۔ اور یاد کیجئے کہ بالکل شروع میں آدمی وحشیوں کی طرح غاروں میں رہا کرتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ صبح بنارس

شام اودھ اور شب و روز مالوہ و کشمیر کس قدر فرحت بار اور روح افزا ہوتے ہیں۔ مگر دوپہر کو اُن میں ایک ناگوار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ موسم گرما میں یہ سب جھانسی اور ایبٹ آباد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بارش کے وقت چیراپونجی بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصولوں کی تعمیل میں وقت و زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی و انقلاب کا وجود لازمی و ضروری ہے۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ قرآن خود اپنی تنزیل کی گواہی دے رہا ہے یعنی رفتہ رفتہ نازل کیا گیا ہے رہا ایمان تو وہ بھی تغیر سے محفوظ نہیں۔ کہتے ہیں کہ صحیح حدیث ہے کہ آخر زمانہ میں ایمان ایسا ہوگا جیسے تالاب کے کنارے حباب ہوتے ہیں جو بنتے ہیں اور بگڑ جاتے ہیں۔ ایسے ایمان سے پناہ مانگنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ بہر حال زمان و مکان کا لحاظ رکھنا ہر زمانہ اور ہر حال میں ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے انقلاب واقع ہوتا ہے جس کی ذہانت و فراست اس تبدیلی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اور فائدہ اٹھا لے وہی بہرکامران اور کامیاب ہے۔ زمان و مکان ہی کے مسلمہ اصول نے مغلیہ سلطنت کو انگلشیہ سلطنت میں منتقل کر دیا تھا۔ مغلیہ سلطنت میں متعدد فرعون تھے اور انگلشیہ کا محض ایک حاکم تھا۔ یہ بٹے ہوئے تھے۔ اور وہ جُڑے ہوئے۔ سیاسی معنوں میں یہاں شرک ہی شرک تھا۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ مذہب میں بھی کئی فرقے ہو گئے تھے۔ انگریز شہدے اور بداطوار تھے لیکن حصول مقصد کی خاطر انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر اچھے بُرے حال میں اپنے حاکم اعلیٰ کی اطاعت کرتے تھے۔ غرض مفتوحین کے لئے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا سرکشی کر کے مقابلہ کریں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے دونوں پر عمل کیا۔ اور دونوں میں سے کسی عمل پر متفق نہ ہو سکے۔ اتحاد کے بغیر جو کچھ بھی کیا بے اصولے پن سے کیا۔ اسی لئے ناکام رہے۔ غور طلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے مقابلہ کی ٹھیرائی اور جہاد کیا اس کا

محرک کون تھا۔ اس میں قیادت کے جوہر تھے یا نہیں۔ اس میں بھٹکے ہوؤں
کے انتشار کو دور کرنے کی اہلیت کس قدر تھی۔ اس محرک کی حیثیت امام یا مجتہد
کی تھی یا نہیں۔ اور وہ زمانہ کی ہوا اور وقت کے تقاضوں پر عبور رکھتا تھا یا نہیں۔
شاہ ولی اللہؒ نے مرض کی تشخیص کر لی تھی اور علاج کے لئے ایک انجمن کی
طرح ڈالی تھی جس کا مطلب تھا کہ ہر طرح کی تیاری کر کے پہلے متحد و مستعد بن
جانا چاہیئے پھر جہاد کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس پر عمل کر
کے حتی المقدور بہتوں میں تبلیغ و تنظیم کا بیڑہ اٹھایا اور وہ منتظر تھے کہ اہلیت
پیدا ہو جانے پر جہاد کا حکم دے سکیں۔ مگر بیماریوں اور قوم میں پوری استعداد اور
اہلیت پیدا نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے جہاد کا حکم نہیں دیا۔ البتہ جب خود
ان کے خاندان والے دہلی سے واپس آئے بعد انگریزوں کو دہلی پر تسلط ہو چکا تھا لوگوں
کے استفسار پر انہوں نے شرعی مسئلہ کے طور پر فتویٰ لکھا تھا کہ اندریں حالات
مخالف سلطنت کے زیر ہو جانے سے ملک کا ملت اسلامی نہیں رہا بلکہ چھوڑ کر دارالحرب ہے
اس فتوے سے جہاد کی آمادگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ حکم نہیں تھا۔ نفس
استفسار کا جواب تھا۔ اب یہ استفسار کرنے والوں کا کام تھا کہ ان معلومات
کے بعد آمادگی ظاہر کرتے اور ان سے رہبری کی درخواست کرتے یا
کسی اور کو سرغنہ بناتے۔ اس فتوے میں کلکتہ سے لے کر لاہور تک کے ملک
کے دارالحرب ہونے کا مفہوم تھا گویا انگریز اور سکھ دونوں سے کیا جا سکتا
ہے۔ یہ کہنا کہ سید احمد صاحب کو پیدائشی طور پر جہاد کا شوق تھا اور ان
کے ابتدائی طفلانہ حرکات سے اور پھر امیر خان کی ملازمت سے ثبوت دینا
محض عقیدتمندی کی دھاندلی ہے۔ ورنہ ان کے علم و شعور میں نفس جہاد کا
مفہوم کبھی ہرگز نہیں تھا۔ اور نہ ان کی زندگی کے مضطربانہ حالات سے اس کی

تائید ہو سکتی ہے۔ ان میں از اول تا آخر تلون موجود ہے۔ وہ معمولی آدمی سے زیادہ وصاف ستھرے تھے۔ اگرچہ وہ مجذوب مطلق نہیں تھے مگر کم از کم دسواں حصّہ مجذوبیت کا ضرور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بے حد عقلمندی کی بات کہتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسی بات فرماتے تھے جو عقل کی حدود سے باہر ہوتی تھی۔ جس کی عقیدت کے لحاظ سے تاویل کرنی پڑتی تھی۔ مگر شاہ اسمٰعیل اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ اور سید صاحب کو سکوت اختیار کرنا پڑتا تھا۔ ان کی نگاہ دونوں طرف تھی۔ جب آسمان کی طرف ہوتی تھی تو وحی کی باتیں کہتے تھے اور جب زمین کی طرف ہوتی تو ایسی باتیں کہتے تھے۔ ایسا شخص عظیم المرتبت ہو سکتا ہے۔ مگر اپنی کمزوریات کی وجہ سے مستقل طور پر لیڈر نہیں بن سکتا تھا۔ البتہ بقول مرزا حیرت دہلوی جہاد کا منصوبہ شاہ اسمٰعیل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت کی بات ہے جبکہ سید صاحب امیر خان کے یہاں سے دہلی نہیں آئے تھے۔ جب یہ حقیقت واقعہ ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا ضرورت ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے دماغ میں جہاد کی تجویز کیسے پیدا ہوئی۔ واقعات سے ظاہر ہے کہ شاہ اسمٰعیل کو بڑا بننے کا شوق تھا۔ طالب علمی میں ان کی ذہانت اس کی گواہ ہے۔ وہ اپنے دماغ میں بہت کچھ رکھتے تھے۔ تمام زندگی میں انہوں نے ہمیشہ نئی راہ نکالی ہے۔ ان کو یہ پسند نہ تھا کہ تقلید و جمود انہیں دبا دیتا۔ جس طرح شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے اپنے والد کی تعلیم کو آگے بڑھایا۔ اور عظیم قبولیت حاصل کی۔ یہ تقلید شاہ اسمٰعیل کو منظور نہیں تھی علم نے انہیں شاہراہ سے ہٹا دیا۔ انہوں نے اپنی جدت کے لحاظ سے اپنی خاندانی خصوصیات سے علیحدگی اختیار کی۔ اور ان کی اس امتیازی خصوصیت کا لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ خاندان کے طریقے سے علیحدہ وطیرہ اختیار کرنا جدت و جرأت کی بات ہے۔ مگر اس کو خاندان سے مایوسی اور خاندان سے رقابت کا بھی سبب

سمجھا جا سکتا ہے۔ بہر حال انہوں نے نئی روش اختیار کی۔ سب سے پہلی حرکت یہ کی کہ خاندانی عقیدے کے خلاف بجائے وحدت الشہود کے وحدت الوجود کی تبلیغ کی، اور ایک رسالہ بھی اس کے متعلق لکھا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ موروثی عقائد میں بھی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ اس کے بعد نئے عقائد کی دعوت سب سے پہلے بدمعاش اور طوائفوں کے طبقہ کو دی۔ پھر قبولیت حاصل کرکے اتنی ہمت بڑھی کہ سحر آفرین جوش تقریر کی وجہ سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ دے کر علانیہ تبلیغ کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے علمائے دہلی نے اعتراض کئے۔ اور مباحثوں کا نتیجہ فساد کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ان ہی ایام میں انہوں نے تقویۃ الایمان لکھی تھی۔ جس میں جہاد کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ابھی تک ان کی توجہ مسئلہ جہاد کی طرف نہیں تھی۔ اب ہوا یہ کہ فساد کے اندیشہ سے دہلی کے ریزیڈنٹ چارلس مٹکاف (۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۹ء) نے شاہ اسمٰعیل کو جامع مسجد میں وعظ کہنے کی ممانعت کر دی جس سے ان کی سخت توہین ہوئی، غم و غصہ میں انہوں نے ضروری سمجھا کہ ریزیڈنٹ سے مل کر خود اپنی صفائی پیش کریں۔ پہلا سابقہ تھا، مگر پہلی ہی ملاقات میں شاہ اسمٰعیل نے زورِ تقریر سے قائل کر دیا۔ اور اس نے نہ صرف اپنے حکم مخالفت کو واپس لے لیا۔ بلکہ ان کی ملاقات پر مسرت کا اظہار کیا اور اس طرح ریزیڈنٹ سے روابط و مراسم قائم ہو گئے شائد حالات زمانہ کی وجہ سے بے چینی بڑھی۔ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ دار الحرب کا ہر جگہ ذکر اور چرچا ہونے لگا۔ اس موقع پر کسی ملاقات میں ریزیڈنٹ نے شاہ اسمٰعیل سے فتوے کا مفہوم سمجھنا چاہا اور ظاہر کیا کہ ہمارے مظالم کی داستان بربنائے غیرت و غصہ ہے مگر در اصل مسلمانوں پر ظلم سکھ پنجاب میں کر رہے ہیں۔ یہ اشارہ شاہ صاحب کی جدت کے لئے تازیانہ ثابت ہوا چنانچہ انہوں نے مظالم کی حقیقت سمجھنے

کے لئے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا۔ پھر ان پر دو حقیقتیں کھلیں یہ کہ سکھ بے حد مظالم کر رہے ہیں اور یہ کہ مظلوم انگریزی عملداری میں پناہ لے کر محفوظ و مامون رہتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کی ٹھان لی۔ اور انگریزوں کو عادل اور ہمدرد سمجھنے لگے کیونکہ شاہ صاحب کے فتوے میں سکھوں سے بھی جہاد کا مفہوم پنہاں تھا کیونکہ شاہ ولی اللہ کا ارشاد انہیں یاد تھا کہ حکومت کرنے کی قابلیت افغانیوں میں منتقل ہو گئی ہے اور کیونکہ انہیں امید تھی کہ انگریز سے انہیں کافی مدد مل سکے گی۔ ان ہی تفکرات میں مبتلا تھے۔ اور راہ عمل طے کرنا چاہتے تھے کہ مٹکاف کا تبادلہ ہو گیا۔ سر اوکٹرلونی جو دوبارہ ریذیڈنٹ بن کر آیا۔ (۱۸۲۵-۱۸۱۸ء) تو ان سے بے تکلفی نہیں تھی مگر پھر بھی انگریزوں کا ہی یہ مشورہ ہو سکتا تھا کہ جہاد دہلی کی سمت سے نہ کیا جائے کیونکہ انگریز مدد نہ دے سکیں گے۔ اسلئے کہ ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ دریائے ستلج حد فاصل ہے اور فریقین میں سے کوئی دوسرے کی حدود میں مخل نہ ہو گا۔ اس دفتری راز اور سیاسی معاہدہ کا حال عام طور پر معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ جبتک کہ خاص طور پر واقفیت حاصل نہ کی جاتی۔ لہٰذا جہاد براہ سندھ و کابل کیا۔ اور اس راہ دراز کی تکلیف برداشت کرنے کا سبب اور انعام یہ سمجھا گیا کہ راستہ کی مسلمان ریاستیں اور کابل سے بخارا تک کی حکومتیں اس کار نیک میں شریک ہو جائیں گی اس مشورہ میں مولانا عبد الحی شریک تھے کیونکہ وہ انگریزوں کی ملازمت کرنے کی وجہ سے انگریزوں کے عادات و اطوار سے واقف تھے۔ بقول میرزا حیرت کہ۔

"شاہ اسماعیل سکھوں سے بدلہ لینے کے لئے کسی رہبر کی تلاش میں تھے"

اس کام میں مدد اور دعا لینے کے لئے مولانا عبد الحی کے کہنے سے شاہ اسمٰعیل سید صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ حالانکہ وہ باوجود وحدت الوجود کے قائل

ہونے کے روحانی لوگوں کے معتقد نہیں تھے۔ تو سید صاحب نے انہیں مسخر کر لیا۔ وہ حیرت کے ساتھ روحانی تسخیر کے معنی سمجھنے میں مصروف ہو گئے اور جہاد کا تخیل ان کے دماغ سے محو ہو گیا۔ اس کو سید صاحب کی برملا اور سچی کرامت بھی کہا جا سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ متعدد بیماریوں میں مبتلا رہتے تھے اور بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سید صاحب میں قابلیت و اہلیت پیدا ہو گئی تو انہوں نے سید صاحب کو دورہ کر کے تبلیغ و دعوت کا حکم دیا۔ اور تنظیم کے درست ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کا خیال ضرور ہو گا کہ جہاد کی تیاری ہو۔ مگر وہ فی البطن تھا۔ چنانچہ اس دورے میں کسی جگہ جہاد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب دورہ ختم کرنے کے بعد بھائی کے انتقال کی خبر سن کر اپنے وطن جانے لگے تو اثنائے راہ میں بمقام رامپور ایک افغانی نے سکھوں کے مظالم کی داستان سید صاحب کے گوش گذار کی۔ تو سید صاحب بیحد متاثر ہوئے۔ مگر حیرت ہے کہ سکھوں کے مظالم کی داستانیں سہارنپور اور مظفر نگر میں زبان زد عام تھیں اور ناممکن ہے کہ سید صاحب نے یہ افواہیں نہ سنی ہوں۔ مگر اثر ہوا تو رامپور میں ایک نامعلوم الاسم افغانی سے معلوم کر کے۔ شاید اسلئے کہ رامپور انگریز کے زیر اثر تھا۔ بہرحال یہ راز سربستہ ہے۔ اس طرح شاہ اسمٰعیل کو جہاد کا بھولا ہوا خواب یاد آ گیا۔ اب سید صاحب کی دعوتوں میں جہاد کا بھی ذکر ہونے لگا۔ اور جہاد کی تیاری بھی شروع کر دی۔ لیکن لکھنؤ میں حج کے مباحث سن کر جہاد کے بجائے حج کا ارادہ کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ریاست اودھ بھی انگریز کے اثر میں تھی لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کہ تبدیلی ارادہ کی وجہ کیا ہوئی یقیناً کوئی معشوق تھا اس پردۂ زنگاری میں۔ سید صاحب ان معاملات اور شاطرانہ چالوں کو نہیں سمجھتے تھے مگر شاہ اسمٰعیل پوری واقفیت رکھتے تھے

ان ہی کے اصرار سے جہاد کی تیاری کی گئی تھی اور ان کے ہی کہنے سے ارادۂ جہاد ملتوی کردیا گیا حج میں یقیناً جہاد کے متعلق تمام جہان کے مسلمانوں کی تائید حاصل ہوتی۔ مگر شاہ اسمٰعیل کے عقائد نے وہاں کے سب لوگوں کو منحرف کردیا۔ لہٰذا حج سے ناکام آکر جہاد کی تیاری کی گئی اور قدم اُٹھا دیا گیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سرحد والے اگرچہ سکھوں کے مظالم سے بیزار تھے۔ مگر سید صاحب نے اس وقت تک کسی قسم کی استدعا نہیں کی تھی۔ اس اثناء میں بارہا انگریزوں سے ان کے خلاف شکایت کی گئی اور اضلاع کے حکام نے بھی گورنمنٹ کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ مگر انگریزوں نے شنوائی نہیں کی اسلئے کہ انہیں یقین تھا کہ دہلی کی سمت اختیار نہیں کی جائے گی۔ اور سکھوں والے معاہدے میں خلل نہیں پڑیگا۔ مدعا یہ کہ تصور جہاد شاہ اسمٰعیل کی کارستانی تھی اور سید صاحب اور انگریزوں کے پردوں پر انہوں نے پرواز کی اگر یہ مان لیا جائے کہ محرک جہاد شاہ اسمٰعیل تھے تو یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ انہیں اجتہاد اور امامت کی اہلیت حاصل تھی یا نہیں۔ اگر ہوتی تو کوئی اس کی تائید کرتا۔ کسی نے انہیں امام سمجھا ہوتا اور اس میں شک نہیں کہ وہ عالم اور ہوشمند تھے مگر ہر شخص اور ہر سوانح نگار اس اہلیت کا سزاوار سید صاحب کو قرار دے رہا ہے اور لکھا ہے۔

"خوشا وہ قوم جس کا نصب العین صرف اعلائے حق و رضائے خدا ہو سید صاحب اسی راستے کے داعی تھے" اور وضاحت فرمائی ہے:۔

"مسلمانوں کی مصیبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے تھے اور روح جہاد سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ صرف احیائے اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی دور اول میں جو عالمگیر برتری حاصل ہوئی تھی وہ خدمت دین کا ثمرہ تھی۔ دور اول کو اسباب قوت حاصل نہ تھے لیکن جذبۂ جہاد کی روح پیدا کردی تھی۔ سید صاحب اسی دور

مسعود کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔"

"سید صاحب کے سامنے تین راہِ عمل تھے یعنی (۱) حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑا جائے (۲) حق کو نہ چھوڑا جائے اور مصائب کو صبر و قناعت سے برداشت کیا جائے (۳) باطل کا مقابلہ کیا جائے کہ حق کیلئے غلبہ عام کی فضا آراستہ ہو جائے سید صاحب نے عزت و عزیمت کی بنا پر اس آخری راستہ کو اپنے لئے زیبا سمجھا اسی کو ان کی دعوت و تلقین کا نصب العین سمجھنا چاہیئے۔"

یہ سب منطق ہے اور وسعت نگاہ کا ثبوت ہے کہ دینی اور دنیوی ہر پہلو پر غور کیا۔ مگر قوت ایمانی کو فراست سے وحیِ الٰہی کے ساتھ استعمال کرنا دورِ اول کی خصوصیت تھی۔ اب اس زمانہ میں دورِ اول کی سی قوتِ ایمانی اور ایمان سے پیدا ہونے والی فراست نہیں۔ پھر وحی و الہام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ دورِ اول کی پختگی ایمان یہ تھی کہ بے تکلف ہجرت پر آمادگی ظاہر کی۔ دورِ اول کی فراست یہ تھی کہ حبشہ کو ہجرت کی۔ وہ نصرتِ الٰہی یہ تھی کہ شاہِ حبشہ نے دشمنوں کی نہیں سنی اور ان مہاجرین کی حفاظت و قدر کی۔ دورِ اول کی بے سرو سامانی جنگ بدر و اُحد سے عیاں ہے کفار کی کثیر جماعت کی نظر میں یہ وحدت پرست معدودے چند خار تھے وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آخر یہ ہیں کیوں۔ اسی وجہ سے ان کے مٹانے کیلئے کفار درپئے آزار تھے۔ مگر یہ نور سے معمور تھے۔ خالص ایک خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے رسولؐ کی آنکھوں کے تارے تھے اور اللہ جل شانہٗ ان کا رفیق تھا۔ حملوں کی خبر پا کر مشورہ ہوا۔ رسولؐ کے ان فدائیوں نے خلوص بے مثال کے ساتھ اپنی بے مائیگی کے باوجود مدافعت کی ٹھانی۔ پھر موقع و محل کا جائزہ لے کر صداقت لبریز خلوص اور پاک نیت کے ساتھ یہ مٹھی بھر صحابہ کفار کی لاتعداد جماعت سے جٹ گئے مگر کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے مطابق دونوں مرتبہ کے پاک خلوص و پاک نیت میں

نئی شان تھی۔ غزوۂ بدر میں نورانی فراست سے زیادہ حمایتِ الٰہی قدم قدم پر کارفرما تھی۔ بگڑے کام سب بن گئے اور فرشتوں کی مدد آ گئی۔ فرشتوں کو اس فوج کو قلب کی فراست سے ہی نہیں بلکہ چشمِ سر سے بھی ہر غازی نے ملاحظہ کیا۔ فتح ہوئی دھاک بیٹھ گئی، اور دولت و عزت حاصل ہوئی۔ اسی طرح جنگِ اُحد میں بھی کامیابی کے آثار نمودار تھے بلکہ فتح حاصل ہو گئی کفار نے ہزیمت اختیار کی۔ مگر جو اصحاب اس حکم کے ساتھ کسی حال میں جنبش نہ کرنا، پہاڑی کے درّہ پر متعین ہوئے تھے۔ انہوں نے فتح دیکھ کر اپنی نورانی فراست سے مالِ غنیمت کی خاطر اپنے مقام کو چھوڑ دیا۔ بھاگے ہوئے شکست خوردہ کفار نے اسی طرف سے حملہ کر دیا۔ اب تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ فتح نے شکست کی صورت اختیار کی اور سب سے زیادہ قیامت یہ ہوئی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید کر دیئے گئے اس کے بعد شانِ کریمی نے جلوہ دکھایا اور دشمن پسپا ہوا اب اگر نورانی فراست والوں سے غلطی ہو سکتی ہے تو پیر فیاض کی فراست تو قابلِ ذکر ہی نہیں ہے فرشتے ہر طرف یہاں تو کسی کو نظر نہیں یہاں جن بھی نہیں دکھائی دیا یہاں دوست و دشمن کی بھی تمیز نہیں تھی۔ جن کی ساری کوشش ظاہری نقل علم معقول اور عجائب پرستی پر مبنی ہو۔ وہ دورِ اول کی نقل کرنے کے مدعی کیسے ہو سکتے ہیں۔

سید احمد شہیدؒ کے تیسویں باب میں شاہ اسمٰعیل نے اعتراضات کے جو جواب دیئے ہیں اس میں یہ بھی لکھا ہے۔

"زمانۂ رسالت میں بذریعہ وحی منافقین کے متعلق علم حاصل ہو جاتا تھا اب وہ ذریعہ باقی نہیں۔ اب صرف علامتوں پر حکم لگایا جاتا ہے"

لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ علامتیں غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ یا اُن کا مطلب غلط بھی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا مفہوم سمجھنا شخصی رائے پر ہی منحصر ہے دراصل

بہترین و بدترین مغالطہ یہی ہے کہ اپنے ہر منصوبہ و فعل کو بغیر کسی سند یا معیار کے دورِ صحابہ کی نقل خیال کر لیا جاتا ہے۔ صراط مستقیم کی فصل سوم میں خود سید صاحب کا ارشاد ہے کہ " اپنی مرضی کے مطابق کسی کام کو رضائے الٰہی سمجھنا غلط ہے۔"

بہر حال باوجود دورِ اول والی خصوصیات نہ رکھنے کی صرف زمان و مکان کو ہی مدنظر رکھا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ دانشمندی سے کام لیا اور پھر دلیری ملاحظہ ہو کہ " دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت کو اپنا نصب العین نہیں بنایا اور صرف احیائے اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی۔"

اب انہیں کون سمجھائے کہ احیائے اسلامیت کا نتیجہ ہی سیاسی عظمت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے سید صاحب کا ایک بازاریٹ کر دیا۔ سید صاحب سے کہلوایا ہے کہ — " میرے دل میں حکومت و دولت کا خیال کبھی نہیں پیدا ہوا۔" پھر خدا کے واسطے کوئی بتائے کہ نواب ٹونک وغیرہ کو چندے کے لئے کیوں لکھا۔ اور آخر میں حکومت الٰہیہ کیوں بنائی۔ جبکہ حکومت بنانے کا نہ علم تھا اور نہ ارادہ۔ چنانچہ ان کے مساعی جمیلہ اور حکومت کا حشر بھی جیسا ہونا چاہیئے تھا ویسا ہی ہوا۔ اس نتیجہ پر جعفر تھانیسری آنسو بہاتے ہیں کہ وعدۂ فتح پنجاب پر مکمل وثوق تھا ——— از روئے شریعت محمدی الہام ایک ظنی چیز ہے۔ ...... سید صاحب کی باوجود جملہ دینی اوصاف، پولیٹیکل پیچیدگیوں اور علم جنگ کی طرف توجہ بالکل نہ تھی۔ ان ہی دو نقصوں نے اس کے بنے کام کو بگاڑ کر اسکو بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا جس کی یاد سے خلقت کے دل دکھتے ہیں اگر ان میں فن ملک گیری اور فن جنگ بھی ہوتا تو پنجاب کیا ساری دنیا کا بادشاہ ہوتا۔"

میرزا حیرت دہلوی کا مرثیہ یہ ہے کہ ——— " مولانا شہید کی رائے پر اعتماد کر

۱؎ مکاتیب اسمٰعیل صفحہ ۲۰۔

لیا گیا کہ رنجیت سنگھ سے سرحدی اقوام ناراض ہیں۔ لہٰذا وہ سب ساتھ آئیں گی۔ اس میں انہیں کامیابی ہو جاتی اگر ان کے عمال بے اعتنائی نہ کرتے اور یک لخت مجبور نہ کرتے کہ وہ ناگوار طور پر شریعت کی پابندی کریں۔ اس میں سرداران سمہ و پشاور کی زر پرستی و بے ایمانی کا بھی دخل و شمول تھا۔ امداد دہلی سے بہت زیادہ بذریعہ شاہ محمد اسحق پہنچی۔ مگر دہلی میں ان کے مخالفین بھی موجود تھے۔ محبوب علی کو شاہ صاحب نے ہی روانہ کیا تھا مگر انہوں نے فتنہ و فساد برپا کر دیا۔ مقصد اشاعت دین تھا۔ ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔"

اب جناب مہر صاحب اپنے استدلال سے دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں۔
"مگر افسوس ہے کہ سید صاحب کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ ان کی (یعنی سرحد والوں کی) اسلامی حمیت بھی پائیدار نہ نکلی۔ اور سید صاحب کی ہزیمت بہت ہی متاع تھی۔ سرحد کی نااہلیت کی نذر ہو گئی۔ لیکن ظاہری عقل کی بنا پر سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم و صائب و پختہ تھا۔ جو کچھ پیش آیا۔ اس کا علام الغیوب کے سوا نے اور کسی کو علم نہیں۔"

اس الزام کا مورد سرحد والوں کو اسلئے بنایا ہے کہ "اہل سرحد نے کہا کہ اس کام کے لئے ہمارا ملک خوب ہے۔ اگر آپ چلیں تو لاکھوں مسلمان شریک ہوں گے خصوصاً رنجیت سنگھ کے مظالم کی وجہ سے ہم نے اس کو تسلیم کر لیا اور کہا کہ ہجرت کر کے وہیں چلو" (سید احمد شہید چھبیسواں باب) سرحد والوں نے اگر ایسا کہا تھا تو سید صاحب کی فراست۔ ولایت اور روشن ضمیری کو کیا ہوا تھا کہ اعتبار فرما لیا۔ اور فریب میں آ گئے لیکن افسوس تو یہی ہے کہ فیصلہ کسی لحاظ سے صائب نہ تھا۔ اب یہ بھی غور طلب ہے کہ سرحد والوں نے ایسا کب اور کس جگہ کہا تھا۔ رامپور میں صرف ایک افغانی کا کہنا کل سرحد کا کہنا نہیں ہو سکتا۔ بعد ہجرت اگر

سرحد والوں نے سرحد پر اگر ایسا کہا تو وہ سند نہیں مانا جا سکتا۔ اسلئے کہ ہجرت تو پہلے ہی کر چکے تھے۔ پنجتار کی مجلس شوریٰ میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں فرمایا تھا کہ:۔

" مجھ کو جناب باری سے ارشاد ہوا کہ دارالحرب ہندوستان سے ہجرت کر کے دارالامان میں جا، اور کفار سے فی سبیل اللہ جہاد کر۔ ہندوستان میں اس لائق کوئی جگہ نہ ملی۔ لوگوں نے کہا کہ ہندوستان میں جہاد کر، ہم ہر قسم کا سامان دیں گے۔ مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اسلئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیئے۔ بلوہ کرنا منظور نہیں۔ آپ کے ولائیتیوں نے اپنے ملک کو پیش کیا کہ سب مسلمان شریک ہوں گے۔ رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے...... اس پر میں نے کہا کہ بہتر ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چلیں اور مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں۔ اس کے بعد علماء سے خطاب کیا، کہ آپ نے ہمیں جگہ دی، بیعت امامت کی، آپ کے مشورہ سے جہاد کیا۔ اب آپ دستکش ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟" (منقول از سید احمد شہید، باب ۵)

اس سے معلوم ہوا کہ ولائیتیوں نے اپنے ملک کو اس وقت پیش کیا۔ جبکہ ارشاد باری ہو چکا تھا اور ہندوستان والوں کی تجویز کو رد کر چکے تھے۔ لہذا یہ بات جو سید صاحب کی زبان سے ادا ہوتی ہے کیونکر صحیح مانی جائے یا پھر حلوہ خوردن را روئے باید۔

ہر عقل اور نوعیت سے یہ جہاد دیوانگی ہی تھا۔ اس کے متعلق یہ بحث کرنا کہ رخ کس کے خلاف تھا۔ ایک مغالطہ ہے۔ یہ بحث غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے نکالی گئی ہے۔ اقوال سید صاحب اور تحریرات شاہ اسمٰعیل سے جہاد کا رخ انگریز، سکھ، چین و ایران اور ہر طرف ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ سید صاحب کی واقعی کرامت ہے کہ معتقدین جہاد کے متعلق صحیح فیصلہ نہیں کر پائے اور نہ کر سکتے ہیں۔

مذکور ہے کہ سید صاحب نے فرمایا کہ "انگریزوں سے لڑنا نہیں ہے" یہ یا تو توریہ[1] ہے یا تقیہ[2] ہے گویا انگریزوں کو اس طرح فریب دیکر ان سے مدد اور ہمدردی حاصل کرنا تھی۔ یا اصل راز کو چھپانا مقصود ہے جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب سوانح احمدی کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ:-

"سید صاحب کے حالات میں جس سے زیادہ بدلائل شرعی، علامات ہیں کہ سرکار کی مخالفت کوئی نہ کرے" وہ مہر صاحب نے اپنی کتاب سید احمد شہید کے چوبیسویں باب میں جہاں شرائط امام کے سلسلہ میں بحث فرمایا ہے کہ:-

"جہاد میں غدار و فساق سے بھی مدد لی جا سکتی ہے غیر مسلم دشمن کے مقابلہ میں غیر مسلم معاہد کو رفیق بنایا جا سکتا ہے"

جب یہی مسئلہ ہے اور صحیح ہے تو رنجیت سنگھ نے پچھ حصہ ملک پیش کرکے معاہدہ کرنے کی کوشش کی تھی اور تصفیہ کے لئے وزیر سنگھ اور فقیر عزیز الدین کو بھیجا تھا۔ اس وقت رنجیت سنگھ کی رفاقت حاصل کرکے انگریز کے خلاف متحدہ جہاد کی کیوں نہیں ٹھیرائی مگر ضد اور کوتاہ اندیشی کا علاج؟ بہر حال سید صاحب کے جہاد کا رخ نگاہ نازنین کی طرح ہر طرف ہے۔ اسکے معتقدین سے اس کے متعلق بحث کرنا اس وقت تک بیکار ہے جب تک کہ وہ خود طے نہ کرلیں۔ ان کا خود آپس میں جو تعلق ہیں وہ الا یا بگٹنا مستحسن نہیں خیال کیا جا سکتا۔ من اندازِ قدش را می شناسم۔ لہذا کیوں دردسر مول لیا جائے کہ جعفر تھانیسری کا کیا خیال ہے مرزا حیرت کی کیا رائے ہے اور جناب غلام رسول مہر صاحب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

ہمیں چاہیئے کہ ایمانداری کے ساتھ خود آپس میں فیصلہ کرلیں یعنی نہ وہ

---

۱ توریہ کہتے ہیں ذو معنی بات کو جسکے دونوں معنے صحیح ہوں۔ کہنے والا کچھ کہے اور سننے والا کچھ سمجھے ۲ تقیہ جھوٹ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور ظاہر اسکے برعکس ہو

ہم سے پوچھیں اور نہ ہم ان سے دریافت کریں کہ اس جہاد نے کھے کا رُخ کدھر ہے
قصہ ختم؛ مغز ما خورد و حلق خود درید

ان کے جہاد کا رُخ اِدھر تھا یا اُدھر تھا، ہمیں کیا۔ مگر غور کرنے کے لائق یہ بات ہے کہ — "سید احمد ابندؒ" کو سکھوں کی طرح انگریز کبھی ظالم خیال کرتی تھی کہ نہیں۔ اس میں مغالطہ اس وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے کہ دونوں کے مظالم ایک سے نہیں تھے۔ سکھ علانیہ کشت و خون کرتے تھے۔ اور انگریز اندر ہی اندر زہر دیتے تھے وہ تلوار سے مارتے تھے اور انگریز حکمت عملی بھرے قوانین سے فنا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں دانستہ یا نادانستہ کبھی کسی موقع پر یہ ظاہر کیا ہے کہ انگریزی سرکار بے رُو و ریا اور عادل تھی۔ تو گویا ان کی علمیت و روحانیت کی رسائی انگریزوں کے مظالم تک نہ ہو سکی۔ وہ ہاتھ میں کھلے ہوئے خنجر کو ہی دیکھ سکتے تھے اور انہیں آستین کے اندر کا دشنہ پنہاں نہیں دکھائی دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے لاکھ ڈھونڈا مگر ہندوستان کے دارالحرب میں کسی جگہ مرکز نہیں مل سکا۔ بلکہ وہاں چارہ مسلمانوں کی درخواست بھی کہ — "جہاد ہندوستان میں کیا جائے اور ہم ہر طرح حاضر ہیں" مسترد نامنظور فرما دی گئی۔ آخر وہ اس فریاد کو کیسے سنتے جبکہ ان کی دُور رس نگاہ کو خود بخود چمکتا ہوا مرکز جہاد ملک پنجاب میں نظر آ گیا تھا۔ حالانکہ وہاں کے حالات و عادات سے بھی واقف نہیں تھے۔ پنجاب والا مرکز یوں نظر آ گیا کہ وہ متحرک تھا۔ اسے چہل قدمی کا شوق تھا، چنانچہ وہ تین جگہ بدلا گیا۔ مرکز کو اگر سیر و تفریح میں لطف آتا تھا تو ان حضرات کے دماغ میں خدا جانے کونسی ہوا بھری تھی۔ جو معمولی سی بات نہ سمجھ پائے کہ

"جو گھر کے اندر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ باہر نکل کر بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے"

اسی لئے ہر شخص کو حق ہے کہ ان سے دریافت کرے،

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

دسویں درکے ناگفتہ بہ حالات ہیں اور شاید منہ چھپاکر آبرو رکھنے کیلئے ہی حج وجہاد کی سوچی تھی۔

اس سب پر بھی خاک ڈالی جاسکتی ہے۔ مگر نہیں نظر انداز کی جاسکتی تو ان کے جہاد کی شرعی حیثیت۔ سید صاحب کے کرامات و عجائبات نے عجیب پردہ ڈال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی متنفس نے اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی۔ بہرحال آج پہلی مرتبہ سمجھنے کی کوشش کرلی جائے صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے دریافت طلب یہ ہے کہ :۔

۱۔ حج افضل ہے یا جہاد۔

۲۔ حج کی وجہ سے جہاد ملتوی ہوسکتا ہے یا نہیں۔

سیرت سید احمد شہید میں صرف مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے اُچٹتا ہوا اشارہ کیا ہے کہ ـــــ "حج جہاد کا مقدمہ ہے" یہ فقرہ بلاغت کی جان ہے۔ اسی طرح روزہ و نماز بھی جہاد کے مقدمہ ہیں۔ لہٰذا اہمیت جاتی رہی۔ ممکن ہے کہ اس بلیغ فقرے کے یہ معنی ہوں کہ بغیر حج کے جہاد واجب نہیں۔ مگر ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حج و جہاد کی فضیلت کا فیصلہ کرنا فقہا کا کام ہے۔ بشرطیکہ وہ آپس میں جدال نہ کریں۔ ایک عامی بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں ترتیب ہے۔ اور یہ ترتیب مراتب کو ظاہر کرتی ہے۔ اس ترتیب میں آخری رُکن جہاد ہے۔ لہٰذا ترتیب و مراتب سے جہاد کی فضیلت کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ جہاد میں آسانی کے لئے نماز کی صورت بدل دی گئی ہے اور اگر نماز جہاد میں ساقط بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جہاد نماز پر فوقیت رکھتا ہے۔ صیام و قیام کی بھی یہی حالت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے۔ کہ اگر کوئی جہاد کی نیت سے گھوڑا پال لے تو اس کی خدمت کرنے کا ثواب

نماز و روزے سے زیادہ ہے۔ شک نہیں کہ نماز و روزہ دونوں عمل شاق ہیں لیکن محدود وقت کے لئے ہیں۔ مگر جہاد والے گھوڑے کی خدمت میں لگا رہنا عمل دوام ہے۔ اسی لئے ثواب بھی زیادہ ہوا۔ نتیجہ یہی نکلا کہ جہاد کو صیام پر بھی برتری حاصل ہے۔ اس کے علاوہ حج عمر بھر میں ایک مرتبہ واجب ہے جیسے مقدور اور توفیق الٰہی کی علیٰحدہ بات ہے۔ اللّٰہم زد فزد۔ اور جہاد میں عمر و زندگی ناقابل اعتماد ہیں۔ حج میں بے حد تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اور جہاد میں ان سب تکالیف کے ساتھ سر ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے۔ شرائط حج سے شرائط جہاد زیادہ وقیع ہیں۔ حج نہ کر سکنے کے عذر کی کچھ شرائط اور رخصتیں ہیں۔ مگر جہاد میں چند ہی شرائط معذوری کے ہیں۔ اب اگر جہاد کی نوبت موسم حج میں آپڑے تو حج ملتوی ہوگا یا جہاد؟ حج کو یقیناً ملتوی کرنا پڑیگا۔ حج محض اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ہے اور جہاد اسلام کی عزت کے لئے ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ شریعت کے پیش نظر جہاد کا دوگونہ مقصد ہے۔ وہ بیک وقت تمدن اور سوسائٹی کے نظام کو بھی بہترین استحکام پر قائم رکھے۔ اور نفوس بشریہ کی تہذیب و تزکیہ کا بھی فرض انجام دے۔ حدیث میں جہاد کو اسلئے رفع درجات کا موجب بتایا ہے کہ مجاہدہ کا عمل دین حق کیلئے ارتفاع شان کا موجب ہوتا ہے۔

جنگ اُحد کی کیفیت مخفی نہیں۔ مقتولین بدر کا انتقام لینے کے لئے قریش کے کفار نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنا چاہی۔ انصار و مہاجرین کی مجلس شوریٰ میں کثرت رائے سے طے ہوا کہ میدان میں صف آرا ہو کر مقابلہ کیا جائے حالانکہ کمئ سامان اور قلت تعداد کے مدنظر رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تجویز یہ تھی کہ قلعہ بند ہو کر مدافعت کی جائے۔ مگر فتح بدر کی شاندار کامیابی اور امداد الٰہی کی تقویت اور جوش کی بنا پر دو در دو ہو کر جنگ کی ٹھیرائی گئی۔ جب حضور

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے۔ تو مہترِ صحابہ نے جوشیلے اصحاب کو ان کی غلطی سے آگاہ کیا اور سب کو قائل کیا کہ رسول کی بات نہ ماننا بدنصیبی و گستاخی کی بات ہے۔ سب منفعل ہوئے اور منتظر رہے کہ باہر تشریف لائیں۔ تو معافی طلب کی جائے۔ اتنے میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود اور زرہ بکتر سے آراستہ ہو کر جلوہ نما ہوئے۔ معافی مانگی گئی، آنحضرت صلعم کی تجویز پر عمل کرنے کا اقرار کیا گیا۔ مگر ارشاد ہوا کہ جب نبی تلوار جہاد کے لئے اٹھا لے تو کمر نہیں کھول سکتا۔ اس لئے طے شدہ تجویز میں تبدیلی یا التوا ممکن نہیں۔ چنانچہ جنگ احد میں فتح ہو رہی تھی۔ مگر حضرت طالوت کی جماعت کی طرح کہ باوجود مخالفت پانی پی لیا تھا۔ احد کی پہاڑی کے ناکہ والی محافظ جماعت نے فتح دیکھ کر مال غنیمت کی طلب میں مقام کو چھوڑ دیا۔ بس قیامت آگئی۔ فتح شکست سے بدل گئی۔ اس ناکہ کی طرف سے موقع کو غنیمت جان کر کفار نے بھاگتے بھاگتے پشت سے حملہ کر دیا۔ یہ مصیبت و شکست نادانستہ طور پر دو نافرمانیوں کا نتیجہ تھی۔ مدعا یہ کہ جہاد کو ملتوی کرنا یا اس کے فیصلہ کو ملتوی کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ یہ اصول ذات نبوی کے لئے مختص ہے۔ مگر یہاں عام مسلمین اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

جملہ تذکرے سیدؒ کے حیات طیبہ کے ظاہر کرتے ہیں کہ شاہ اسمٰعیل کے فتوی کی بنا پر جس کی تصدیق شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی کی تھی۔ متروک حج کو باوجود راہ کے خطروں کے جاری کرنے کے لئے سید صاحب نے جہاد کو ملتوی کیا تھا۔ مرزا حیرت کا بیان ہے کہ:

"چند ادنیٰ آدمی جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے حج کو روانہ ہو گئے تھے اور جہاد کو ملتوی کر دیا تھا" تذکرہ نویسوں کی مختلف آراء سے بھی کوئی مطلب نہیں۔ وہ اپنے اختلاف کو خود طے کریں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل کا فتوی صحیح تھا یا غلط یا حسب معمول ان کی جدت کا اظہار تھا۔ حج کے شرائط میں امن طریق کی شرط نہایت اہم

ہے۔ اگر امن طریق نہیں تو ہر آئینہ حج بھی نہیں۔ اب کیسے مان لیا جائے کہ خلاف شرع شاہ عبدالعزیزؒ نے فتویٰ کی تصدیق کر دی تھی۔ یہ قطعی غلط بات ہے۔ اب اس جدت و تجدید کی تصدیق ضروری تھی تو سید صاحب کے الہام کو کیا ہوا تھا۔ کہ تصدیق نہ کر سکا۔ اور شاہ اسمٰعیل کی رائے اور فتوی پر عمل کرنے پہ راضی ہو گیا۔ الہام نے یقینی تصدیق کر دی ہو گی۔ چنانچہ مولانا مہر صاحب نے اپنی کتاب سید احمد شہید میں نہایت حسین و خوشنما نظارہ کھینچ کر اسی قسم کا اشارہ کیا ہے۔ اگر اس طرح جہاد کا التوا رجائز قرار دے بھی لیا تھا۔ تو نتیجہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ مگر مقصد جہاد کس درجہ تک انہوں نے حاصل کیا۔ ان کے ہر تذکرہ میں انتشار کی داستان ہے۔ لہذا تمدن و سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ تہذیب و تزکیہ نفوس بشریہ محتاج ثبوت ہے۔ بہر حال خطرہ راہ کی صورت میں حج کا جواز گومگو کا معاملہ ہے۔ جب مسئلہ شک میں پڑ گیا تو جواز ممکن ہی نہیں۔ اس مغالطہ کے مد نظر جہاد کو ملتوی کر دینا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ لہذا سمجھ ہی نہیں آتا کہ سید احمد اینڈ کو کو التوائے جہاد کا حق تھا یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

دشمنوں کا ذکر نہیں دوستوں میں بھی کوئی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی طرح اس جہاد کی ناکامی کا منکر ہو۔ احباب و سوانح نویس آنسو بہاتے ہیں۔ مگر ناکامی کے اسباب پر غور نہیں کرتے۔ کوئی خامیاں بتاتا بھی ہے تو مطعون کر دیا جاتا ہے۔ غرض کسی طرح یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ قافلہ کیسے لٹا۔ انہیں تو اس جہاد کی خصوصیت پر فخر ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے زبان اور سنان سے ایک ساتھ جہاد کیا گیا تھا حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے پیر مغان ابن تیمیہ کے سر اس خصوصیت کا سہرا ہے۔

بہر حال ان ہی قابل فخر خصوصیات میں ان کی ناکامی و شرمندگی کا راز بھی بند ہے قلمی کارنامے گواہ ہیں کہ افتراق بین المسلمین کا زہریلا تخم بو دیا۔ تقویۃ الایمان نے اتحاد کی جڑ کاٹ دی صراط مستقیم نے دور باش کا نعرہ لگایا۔ اور مکتوبات میں

محض سخن سازیاں ہیں۔ دعوت نامے اور خطوط بے اثر ثابت ہوئے۔ زبان اپنی ہے۔ جدھر چاہی اُدھر پلٹ دی۔ اس کی سحر آفرینی عجائب پرستی میں منتقل ہو گئی۔ کرامتوں کی تاثیر نے عقل و شعور سے بے نیاز کر دیا۔ اندھی تقلید اور عقیدتمندیوں نے شریعت و طریقت کو نئے لباس میں ملبوس کر دیا۔ پندار نے آگ لگا دی۔ خودی و نفس نے خاک اُڑا دی اور روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جہاد میں نوکِ سنان ترچھی ہو گئی اور چلتے چلتے شمشیرِ آبدار اپنوں پر ہی وار کرنے لگے۔ حیرت یہ ہے کہ یہ موحد اپنے عقیدہ کے خلاف عجائب پرستی اور شخصیت پرستی کے قائل کیسے ہو گئے؟ ارادتمند جس مقبولیت و شہرت کے مدعی ہیں وہ خود ان کے مختلف البیان تذکروں سے ثابت نہیں ہوتی۔ آخر سے ابتدا کا سلسلہ نہیں ملتا۔ اور اب تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آغاز و انجام دونوں غلط ہیں آنکھ کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔

اس زمانہ میں جبکہ سید صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ سکھ بارک زئیوں[۱] کی لڑائیوں کی وجہ سے پریشان و خستہ تھے اور رنجیت سنگھ خود امرتسر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ دُور بین سیاسی نگاہ ہی اس موقع سے فائدہ حاصل کر سکتی تھی۔ اور اس موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ مگر اس نزاکت کی روحانی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اسلئے کہ وہ دنیا پر نہیں بلکہ اسلامیت پر فدا ہے۔ نقل را چہ عقل۔ اسی موقع پر انگریز نے ان مجاہدوں اور غازیوں کی خوب کاسہ لیسی کی خود دعوتیں کیں اپنی مدخولہ مسلمان کسبیوں کو مرید کروایا۔ اور نذرانے دیئے۔ تحفے پیش کئے۔ اور دوسروں کو بھی ہمت افزائی کے لئے آمادہ کیا۔ ممکن ہے کہ ازراہِ ہمدردی سیاسی اونچ نیچ

---

[۱] قندہار۔ غزنی۔ کابل۔ پشاور۔ کوہاٹ اور ہشت نگر میں بارک زئیوں کی حکومت محدود تھی۔

بھی سمجھائی ہو۔ کلکتہ میں اپنے یہاں بُلا کر شاہ اسمٰعیل کا وعظ سُنا۔ یہ بھی یقین دلایا کہ ہم مانع جہاد نہیں، بشرطیکہ ہماری عملداری میں فتنہ واقع نہ ہو۔ یعنی رنجیت سنگھ والا معاہدہ شکست نہ ہو۔ اپنے ملازمین کو شرکتِ جہاد کی بھی اجازت دی۔ اور دہلی سے بھیجی ہوئی غائب شدہ ہنڈی بھی وصول کروائی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سید صاحب نے بھی اعلان فرما دیا کہ ہم کو انگریزوں سے لڑنا نہیں ہے۔ اگر اس اعلان میں فی الحال کا لفظ بھی شامل کر دیتے تو بات بن جاتی، مگر انہوں نے تو انگریزی حکومت کو بے رو رعایا اور غیر متعصب بتایا ہے۔ اور شاہ اسمٰعیل نے اس اعلان کی تعمیل میں یہاں تک کہہ دیا کہ جو انگریز کا دشمن ہے اس کے ہم دشمن ہیں۔ بعد کے تذکرہ نویس ان اعلانات کو محرّف، در غلط ثابت کرتے ہیں۔ خدا جانے متقدمین جھوٹے ہیں یا متاخرین(۱) مگر اتنا ضرور ہے کہ معاملہ گومگو کا ہے۔ بہرحال سید صاحب کو دہلی کی طرف سے حملہ کرنا آسان تھا، مگر انہوں نے راہ دور دراز اختیار کر کے سندھ و کابل کی طرف سے جانا مناسب سمجھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح اُس طرف کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ انگریز اور رنجیت سنگھ کے معاہدہ کا پاس ہو جو ۱۸۰۹ء میں ہوا تھا۔ مگر یہ پاس اور رعایت ہی کے دلائل قوی ہیں۔ یہ عذر کہ ہندوستان میں مرکز جہاد طے نہیں ہو سکتا۔ اسلئے پنجاب کے حملہ کا تہیہ کیا، معمہ سے کم نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اجنبی ملک میں مرکز جہاد مقرر کرنا سراسر عقل کے خلاف ہے، جبکہ اس ملک سے واقفیت تامہ نہ ہو۔ انگریزوں سے اگر جہاد کرنا تھا تو یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کی کل آبادی (جس میں مسلمان اور غیر مذہب والوں کے امیر و غریب سب طبقے شامل تھے) انگریزوں سے بے طرح بیزار تھی۔ اب اگر کابل کی راہ دراز اختیار کرنے کے بجائے

---

(۱) متقدمین جھوٹے ہیں یا متاخرین؟ اس موضوع پر ایک صاحب کام کر چکے ہیں، جب اُن کا یہ تحقیقی کارنامہ منظرِ عام پر آئیگا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائیگا (ناشر)

بجائے مسلمانوں میں اور پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اتحاد کی راہ نکالی جاتی تو یہ زیادہ آسان تھی اور ظاہر ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت سے جہاد کرنے کے لئے دوسری غیر مسلم حکومتوں سے مدد حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ سب جماعتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ مگر یہ افتراق پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ انہیں اتحاد سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کی تعلیم، ان کا عمل اور ان کا خلق اور طریقہ افتراق کی شہادت پیش کرنے کو ہر وقت حاضر ہے۔ [illegible] جگہ ان ہی کے تذکروں میں موجود ہے۔ [illegible] ان کی زبان حال سے [illegible] حقیقت کا اعادہ کر رہی ہے۔ آنکھ [illegible] شاہد ہے۔ [illegible] شاہ ولی اللہ [illegible] ہو گئی [illegible] وحدت الوجود [illegible] وحدت الشہود [illegible] یہ تینوں اپنی اپنی جگہوں کے مخالف [illegible] تیار [illegible] سید صاحب کا مسلک کشف و شہود پر مبنی تھا۔ وہ [illegible] واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ مولوی عبدالحی [illegible] مدرسہ [illegible] نہ رکھتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل کو اپنی قیل و قال کی وجہ سے [illegible] کمال [illegible] سید صاحب کی روحانیت کا ترجمہ مولانا [illegible] اپنے اپنے [illegible] مطابق اپنی اپنی زبان میں کیا کرتے تھے۔ [illegible] علم و فضل نے شاہ اسمٰعیل کو تقلید کا منکر بنایا۔ اسی علم و فضل نے مولوی عبدالحی سے تقلید کی حمایت کروائی۔ اور یہ دونوں سید صاحب کے روحانی مفہوم کو نہیں سمجھ سکے۔ اگرچہ یہی دونوں ان کے دست بازو اور ان کی تعلیم کو مشتہر کرنے والے تھے۔ جب ان میں اعتدال و اتصال کی کوئی صورت نہیں تھی تو افتراق کو اپنا رنگ جمانا تھا لہٰذا اتحاد کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ عذر کہ سرسید حالات سے ناواقف تھے۔ جیسا کہ سید صاحب کی زبان سے آخر میں اقرار کروایا ہے تو کیا

ضرور تھا کہ وہ سرحد تشریف لے جاتے اور عقل حیران ہے کہ باوجود ناواقفیت کے انہوں نے وہاں مرکزِ جہاد کیسے بنایا۔ مہر صاحب کا ارشاد ہے کہ :۔

سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم و صائب تھا اور خود بھی سید صاحب نے ایسا ہی اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک فطرتی کرامت ہے اور فطرت اسی صورت سے سبق پڑھایا بھی کرتی ہے کہ اس جہاد کے متعلق مجاہدین اور سکھوں کے بیانات ایک میدان میں جمع نہیں ہو سکتے۔ دونوں کی روایتوں میں زمین و آسمان کا بُعد، اختلاف ہے۔ سکھ اس جہاد کو برگ کاہ کی برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی تاریخوں میں ایک شدنی واقعہ کا معمولی سا ذکر ہے اور مجاہدین اپنے کارنامہ کا اس قدر غلغلہ مچاتے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ علماء و فضلا میں کوئی غلط انداز ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس اعجوبہ روزگار حرکت سے اَن ہونی کو ہونی بنا دیا ہے اور ناممکن کو ممکنات میں داخل کر دیا ہے۔ واقعی دُور کے ڈھول کی آواز سہانی معلوم ہوتی ہے۔ جنگ اکوڑہ کے متعلق دونوں اپنی اپنی راگنی الاپتے ہیں۔ اگر کافر جھوٹ کہہ رہا ہے تو اتنا جرم نہیں جتنا کہ مومن کی غلط بیانی سنگین جرم مانی جا سکتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ بدھ سنگھ کو شاندار کامیابی ہوئی اور مجاہدین کا دعویٰ ہے کہ ہم نے سکھوں کو بے نقط شکست دی۔ وہ کہتے ہیں کہ مجاہدین کا نقصان عظیم ہوا۔ یہ کہتے ہیں کہ سکھ اس قدر مارے گئے کہ روئے زمین سُرخ ہو گیا۔ اور میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور ہمارے صرف ۳۶ یا ۳۷ غازی کام آئے اور تقریباً اتنے ہی زخمی ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہماری کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ جعلی حکمنامہ دکھا کر قلعہ گوبندگڈھ پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے رنجیت سنگھ بدھ سنگھ سے ناراض ہو کر اسے سزا دینے کی فکر میں تھا۔ مگر اکوڑہ کی کامیابی پر بدھ سنگھ کا قصور معاف کر دیا گیا۔ وہ یہ بھی اقرار کرتے ہیں۔ کہ اکوڑہ فتح کر کے جب ہم جہانگیرہ پہنچے تو غازیوں نے ہمیں محصور کر لیا۔

لیکن جب رسد ختم ہو گئی تو مرتا کیا نہ کرتا، بدھ سنگھ کو مورچوں سے باہر آنا پڑا۔ اور بڑی خونریزی کے بعد اس نے غازیوں کے منہ پھیر دیئے اور سید صاحب کے جانباز مجاہدین کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے کی [illegible] پڑی۔ یہاں سے بھاگ کر مجاہدین نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ وہ عرصہ دراز تک سر نہ اٹھا سکے۔ برخلاف ان کے یہ کہتے ہیں کہ وہ میں شکست کھا کر بدھ سنگھ نے پھر سراسیمہ لشکر کو جمع کیا اور پیچھے سے [illegible] مجاہدین بڑی ہوشیاری سے خیر و خوبی سے بندی سے باہر نکل آئے اور سکھ ان کا تعاقب نہ کر سکے۔ مجاہدین کے بیان [illegible] تذکرہ نویسوں کا دعویٰ ہے کہ یہ جنگ بدر [illegible] کی طرح یوم الفرقان تھی۔ مزید بیان ہے کہ بدھ سنگھ روپوش [illegible] قلعہ کے قلعدار نے اسے گرفتار کر لیا [illegible] پکڑ [illegible] [illegible] اور اپنے قبضہ و تصرف میں کر لئے [illegible] اگرچہ سکھوں نے نامی [illegible] [illegible] گھنٹے سے مجاہدین کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی اور مجاہدین کی تعداد [illegible] [illegible] فرقین [illegible] نات دیتے ہی [illegible] کی جنگ عظیم کے وقت حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

نہ برٹش کی جیتی ہے نہ [illegible] کا بنتا ہے

اب انھوں کی بھی کی سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ واقعہ صرف [illegible] سے پیر [illegible] کے معاہدات سے کوئی تعلق نہ تھا [illegible] نگاروں نے فرنشی رام بھائی کی [illegible] ہے [illegible] یہ دیکھ کر کہ ملکی مال غنیمت [illegible] واپس آ رہے تھے تو سکھوں نے تعاقب کیا۔ تو سید صاحب نے اس شرط پر چند قندھاریوں کو اجازت دی۔ کہ ملکیوں کو گزند نہ پہنچے مگر چند ہندوستانی غازی بھی بلا اجازت چلے گئے تھے۔ پھر مال غنیمت کی تقسیم پر ملکی باوجود سید صاحب کی ہدایت و تاکید کے راضی نہ ہوئے۔ اور کہنا نہیں مانا۔ مولوی عبدالحئی کئی ماہ بعد یہاں پہنچے تو جنگوں کا حال سن کر فرمایا۔ کہ تیاری کے بغیر سید صاحب غازیوں کو لے کر

دریا پر پہنچے۔ ان کو دیکھتے ہی دشمن بھاگ گیا۔ ۱۸۲۷ء کی جنگ شیدو عجب پُر بہار داستان رکھتی ہے۔ نوشہرہ میں یہ پہلی جنگ صبح کو ہونے والی تھی۔ رات میں سید صاحب کو قے آئی اور بے ہوش رہے صبح کو اسی حالت میں ہاتھی پر سوار کر کے سید صاحب کو شاہ اسمٰعیل برکت کے لئے لے گئے۔ زور کی لڑائی ہوئی مگر یار محمد خان نے جنبش نہیں کی۔ اور فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ وہ میدان سے فرار ہو گیا۔ سید صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اور انہیں کسی بات کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ منافقوں کی وجہ سے گزند پہنچا مگر مومنوں کی ہمت میں فتور نہیں ہوا۔ سید صاحب کو زہر دیا گیا تھا۔ زہر کے اثر کو زائل کرنے کے لئے سید صاحب کو تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ پھر صوات و بنیر کا دورہ کیا۔ ان حالات پر ناطقہ سر بگریباں ہے انہیں کیا کہیے۔

سکھوں کی تاریخ صاف صاف اعلان کر رہی ہے کہ سید صاحب کے چند مذہبی دیوانوں نے یہاں کی پہاڑیوں کی رنگ برنگی جماعتوں کی سرداری کر کے ہل چل ڈال دی تھی۔ مگر ان کا وقتی جوش پھونس کی آگ کی طرح کا تھا کہ ذرا سی دیر میں شعلہ ختم ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں میں صرف بگاڑنے کی قابلیت تھی۔ بنانے کی قابلیت نہیں تھی۔ نتیجہ آخر یہ ہوا کہ سکھوں کو فتح ہوئی۔ سکھوں کا بیان غلط ہو یا صحیح۔ مگر انہوں نے ان کی افتراق پیدا کرنے والی پالیسی و تعلیم کا صحیح صحیح اندازہ ضرور کر لیا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ اس جہاد کی حقیقت اس طرح بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ ان کے راویوں اور تذکرہ نویسوں کی عقیدتمندی قصیدہ گوئی، سخن سازی، مرثیہ خوانی، اور علمی و منطقی تاویلوں کو صرف نظر کر کے محض واقعات سے مطلب سمجھا جائے اور خود اپنی ذاتی رائے قائم کی جائے۔ طائرانہ نظر جو نظارہ پیش کرتی ہے۔ وہ یہ ہے ——— یہ صحیح ہے کہ انہوں نے جہاد کی تحریک شروع کی۔ اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان میں اہلیت بھی تھی یا نہیں۔ بالفرض یہ اہل تھے تو ان کا طرز عمل صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ سرحد کے حالات سے اور وہاں والوں کے خواص سے مطلق

وقعت نہیں تھی۔ ان میں بہت کم ملا تھے۔ طبیعت اور جرأت والے تمام
نیم مردہ اشخاص تھے۔ یہ میدان کارزار میں مجاہدانہ کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی
فاقہ معمور زندگی ان میں جرأت پیدا ہی نہیں کر سکتی تھی۔ میرزا حیرت دہلوی نے
حیات طیبہ میں اسی قسم کا نقشہ کھینچا ہے۔

جہاد کے لئے امیر کا انتخاب فرض ہے لیکن دقت یہ تھی کہ علمائے ہند کے سامنے
جوش اور حقیقی تمناؤں میں امیر کا انتخاب نہیں ہوا۔ ہندوستان میں عیسائی حکومت اس
کے مانع تھی۔ جب اعتراض کیا گیا تو بتایا کہ سید صاحب مامور من اللہ ہیں۔ یہ جواب
سید صاحب ہی دے سکتے تھی مگر مامور من اللہ تو نبی ہوا کرتے ہیں۔ سید صاحب
نبی تو نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ... جیسا کہ ... ثانی سے
نبی ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہے۔ اگر اس دعوی کو تسلیم بھی کر لیا جائے
تو ... پھر اور کس کو کہا گیا کہ مامور من اللہ کو انتخاب کے ذریعہ امیر بنانے کے
کیا معنی۔ یہ تو خود دعوی کی تکذیب ہے۔ اب اگر حسن تدبیر دور اندیشی اور
مردم شناسی کا جائزہ لیا جائے تو ان کا مذبذب دیکھنے سے تعجب پر ہمیں پہنچ دیتا۔
جہاد کا ارادہ کیا جاتا ہے مگر ... باقی ہے۔ ... میں جب جہاد کا سودا سمایا
تھا تو ۱۲۳۹ھ میں مرتبہ وغیرہ چھوڑ کر ... کی جانب ... اور مولانا
عبدالحی اور شاہ اسمعیل کو ترغیب جہاد دی اور چندہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان
کے اطراف میں بھیجا گیا۔ ۱۲۴۰ھ میں تاخیر کے بعد شاہ عبدالعزیز کے وصال پر تعزیت
کرنے یہ عزیزان خاص دہلی بھی پہنچے تھے۔ اور سلسلہ کا کام بھی کیا تھا۔ جامع مسجد
میں جو وعظ فرمایا تو تقویۃ الایمان کے خلاف شاہ رفیع الدین کے صاحبزادگان مولوی
مخصوص اللہ و مولوی موسیٰ۔ شاہ عبدالعزیز کے قابل فخر شاگرد مولوی رشید الدین خاں
مولوی محمد شریف مولوی عبداللہ آخون شیر محمد اور مولوی فضل حق خیرآبادی وغیرہم

کا دستخطی استفتا ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ طویل بحث و تکرار کے بعد مولوی عبدالحی
نے اس پر دستخط فرما دیئے۔ یعنی تقویۃ الایمان کی لغویت کی تصدیق کر دی اور شاہ
اسمٰعیل سوئے مزاجی و بد زبانی کا اظہار کر کے وہاں سے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر بہت سے
معتقدین تائب ہو کر ان کی جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی
فہرست میں دہلی والوں کے نام خالی خالی ہیں۔ یہاں کے علماء کی شیر جماعت جب
مخالف ہو گئی تو ان کی مقبولیت کو کون صحیح سمجھ سکتا ہے۔ مگر بتایا گیا ہے کہ مجاہدین
کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاد میں شرکت کیلئے معدودے
چند لوگ ہی آئے۔ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء مطابق ۷ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ بعہد اکبر ثانی
جبکہ چارلس مٹکاف (۱۸۲۷ء، ۱۸۲۵ء) دوبارہ ریزیڈنٹ ہو کر دہلی آیا اور جبکہ
لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل تھا، جہاد کے لئے کوچ کیا۔ بقول سوانح احمدی دو ہزار اور
بقول دیگر تذکرہ جات چار سو سے ساڑھے چھ سو تک مجاہدین کی جمعیت تھی اب
سمجھ کیا جائے تو کس سمت کو۔ واللہ اعلم۔

سفر تجارہ میں الہام ربانی ہوا تھا کہ "پشاور سے تا دریائے ستلج ہندوستان کی
طرح تمہارے ہاتھوں یہ ملک رشک افزا چمن ہوگا" مگر خدا کے واسطے کوئی سمجھائے کہ
ان کے ہاتھوں ہندوستان کب رشک افزا چمن ہوا۔ بلکہ انگریز کے قانونوں سے
ہندوستان گرتا ہی چلا گیا۔ اس الہام ربانی سے انگریز کا تدبر صحیح نکلا۔ استغفراللہ
وزیرالدولہ رسالہ محمد یعقوب کی روایت کے مطابق جہاد کے لئے روانہ ہوتے وقت
اپنی ہمشیرہ سے فرمایا تھا کہ جبتک ہند کا شرک، ایران کا رفض، چین کا کفر اور افغانستان کا
نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو لے گی۔ اللہ رب العزت مجھ کو
نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر دے یا

حـ منقول از سیف الجبار مصنفہ مولوی فضل رسول بدایونی ؒ

تصدیق خبر پر حلف بھی کرے۔ کہ سید احمد میرے روبرو مرگیا یا مارا گیا۔ تو تم اس قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا۔ کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کرکے مجھے ماریگا۔" فقیر دریں باب۔ باشارات غیبی ماموراست و باشارات لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شبہ و وسوسہ شیطانی و شائبہ ہولت نفسانی بایں الہام مندرج نیست۔ یہ بڑی اہم بشارت ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلئے کہ فہم سے بالاتر ہے اور بعض جاہلوں نے اسی کی بنا پر یہ یقین کرلیا کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہوئے ہیں۔ اور اس کی تکمیل کے لئے پھر جلوہ فرما ہونگے۔ دیگر متعدد گواہیوں کے علاوہ جعفر تھانیسری کا خط نہایت اہم ہے کہ ۱۸۶۳ء میں دقت ربانی پیام وسلام پہنچنے کا فخر حاصل ہوا مجھے حضرت مرشدنا کی حیات وظہور کا ایسا یقین ہے جیسے اپنی موت کا۔

ایک برس دس مہینہ دعوت جہاد دی تھی۔ وقت رخصت اپنی بیویوں کو پانچ ہزار اسلئے دیئے تھے کہ ان کے گذارے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مگر جب وہ سندھ جا پہنچیں اور انہیں لشکر کی عسرت کا حال معلوم ہوا۔ تو بڑی بی بی صاحبہ نے دس ہزار کی رقم بذریعہ ہنڈی عیسیٰ خیل و کالا باغ بہادر شاہ خان کے ہاتھ سید صاحب کے پاس بھیج دی تھی ہجرت کی خبر روانگی سے پہلے ہو چکی تھی۔ لوگ تکیہ شریف میں آنے لگے (سید احمد شہید باب ۲۶)

رائے بریلی سے جب گوالیار پہنچے تو غازیوں کو پانچ ہاتھیوں میں تقسیم کیا پندرہ روز تک ٹونک میں قیام رہا۔ اس موقعہ پر نواب امیر خان کو بیعت سے مشرف فرمایا۔ سیف الجبار میں ٹونک کا ایک واقعہ درج ہے۔ سید صاحب کے خادم میاں الطاف پر وحی آتی تھی کیفیت طاری ہونے پر اہل مجلس کو اپنی چادر سے نکال کر بہشتی میوے تقسیم کیا کرتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے بطرق سے سید صاحب کے مناقب یہ بیان کیا ہے کہ سید صاحب کی توجہ سے میاں لطاف کو یہ مرتبہ حاصل ہوا ہے چند رقعوں

ے سوانح احمدی ص۹۲ و ص۲۴۲ ... ذیر اللہ والے نے بھی تصدیق کی ہے اور جھوٹی شہرت بھی یہی فرمایا تھا۔

اور خصوصاً سید صاحب کے بھانجے سید حمید الدین کو یہ لغویت ناگوار تھی۔ ایک روز سید حمید الدین کے حصہ میں ایک چھوارہ آیا۔ تو اس میں کیڑا تھا۔ انہوں نے طنز کے ساتھ اہل مجلس کو دکھایا کہ بہشتی میوہ میں بھی کیڑے ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے اس بات پر عتاب فرمایا۔ وہ جلے ہوئے تھے۔ اگلی مرتبہ سید حمید الدین نے چادر گھسیٹ کر میاں لطاف کو ننگا کر دیا۔ تو کرامت کھل گئی۔ رانوں کے بیچ میں میوے کی تھیلی بندھی ہوئی تھی۔ وہ خبیث ذلیل و خوار ہوا۔ سیف الجبار کی اشاعت تک میاں لطاف بقید حیات تھے۔ اب سوائے اس کے اور کیا کہا جائے ۔۔ کہ بکجا ماند مسلمانی ؟

ٹونک سے اجمیر چار منزلیں ہیں۔ اجمیر میں پانچ روز ٹھیرے۔ اجمیر سے مولانا عبدالحی کو بعض کاموں کے لئے (کاش تفصیل بتا دی جاتی) دہلی بھیج دیا۔ حیرت ہے کہ خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ میں حاضری دینے کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید خواجہ غریب نوازؒ نے اس خیال سے کہ انہیں زحمت گوارا ہوگی۔ حاضری سے مستثنیٰ کر دیا ہوگا۔

نواب وزیر الدولہ رقمطراز ہیں کہ ۔۔ "میں ٹونک سے اجمیر تک ہمرکاب تھا اس سفر میں بارہا اتفاق ہوا ۔۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ کبھی سید صاحب ایک طرف کو مخاطب ہو کر سلام علیک کرتے اور کبھی سلام کا جواب دیتے یا کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ظاہرا یہ سلام اور سوال و جواب رجال الغیب یا ارواح یا اجنّہ سے ہوتا تھا کیونکہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ایک گروہ رجال الغیب کا خداوند تعالیٰ کی طرف سے سفر و حضر میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس گروہ کا عجیب حال ہے۔ جس ملک یا شہر میں ترویج ہدایت باری تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ جماعت قدسیہ بہت کثرت سے وہاں جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ رب العزت کو ہدایت کرنا کم ہوتی ہے تو جماعت قدسیہ

۔ ایک کتاب میں یہی واقعہ میرٹھ کا لکھا ہے۔ مگر سید صاحب سفر حجاز سے پہلے غالباً میرٹھ نہیں گئے تھے اور نہ شاید بعد میں گئے۔

بہت کم تر ہوتی ہے۔ دوسرا حال، اس جماعت قدسیہ کا یہ ہے کہ جماعت مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے فاصلہ پر اترتی تھی۔ اور جب ارادہ الٰہی حملے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اسی طرف کو چلنے لگتی ہے۔ تب ان کی روانگی کو دیکھ کر ہمیں خود بخود اس طرف کو چلنا پڑتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ سید صاحب بعض جگہ مہینوں ٹھیرے رہتے تھے اور پھر یک بیک چل دیتے تھے

یک دم زیست بگو جناں اختیار ما

در دست دیگر است سکون و قرار ما

یہ نواب وزیر الدولہ کا چشم دید واقعہ ہے اور اس کی انہوں نے خود سید صاحب سے تحقیق کی تھی۔ اس میں بھی کوئی شک اور اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کیا انبیاء علیہم السلام بھی بادی النظر میں روانگی کرتے تھے۔ سید صاحب کو جو علم ہوتا تھا وہ بذریعہ الہام ہوتا تھا یا اللہ جل شانہ خود ان سے فرماتا تھا و یا پھر فرشتہ کرتا تھا۔ اب وہ زمانہ چلا گیا ہے علم بذریعہ رجال الغیب حاصل ہونے لگا تھا اور وہی ہر وقت سفر و حضر میں ساتھ رہا کرتے تھے گو کلام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے حرکات و سکنات سے مفہوم سمجھ لیا جاتا تھا۔ اب یہ بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس علم کا جو ذریعہ تھا مثل کشف یا پیر آخری رجال الغیب والا بہرحال اس وقت تک کوئی تعبیر نہیں کیا جا سکتا تو اس آخری طریقہ میں تنوع ضرور ہے۔ اور یہ بھی ترقی کی ایک شکل ہے۔

اثنائے راہ میں سید صاحب امرکوٹ جانا چاہتے تھے۔ حاجی عبدالرحیم ولایتی فاطمی کو قلعہ دار کے پاس بھیجا۔ نائب قلعہ دار بد رخی سے پیش آیا اور اجازت نہ دی۔ پیر میران سندھ نے چونکہ شاہ کی ہدایت کے مطابق کہ مزاحمت نہ کریں حیدرآباد میں استقبال کیا۔ حیدرآباد کے قیام میں جہاد کے متعلق خط بہاول خان کو بھیجا۔ یہاں دعوت جہاد کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ رانی پور میں سید صبغۃ اللہ شاہ راشدی سواروں کے ساتھ ملاقات

کو آئے۔ پیر کوٹ کو اہل و عیال کی اقامت کے لئے منتخب کیا۔ شکارپور میں حاکم شہر نے اس شبہ پر کہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ حکم دیا کہ غازی شہر میں داخل نہ ہوں مگر شبہ دور ہونے پر اجازت دیدی اور وقتِ رخصت گھوڑے کے علاوہ میر نے سانڈنی پیش کی۔ جو کابل تک سید صاحب کی سواری میں رہی۔ اس کے بعد علاقہ بلوچستان میں سفر کیا۔ قلت کو دیکھ کر عزم جہاد کے متعلق وسوسوں میں لوگ مبتلا ہے یا انگریزوں کا جاسوس سمجھا۔ پھر کوئٹہ سے آگے استقبال ہونے لگا۔ مگر سید صاحب نے غازیوں کی تعداد اپنے ساتھ اسلئے کم لی تھی کہ غازیوں کے رسالے بعد کو پہنچتے رہا کریں گے۔

جب منزل بہ منزل قندھار پہنچے تو نواب بہاولپور اور امیرانِ سندھ کی بے اعتنائی کا بدلہ پورا ہو گیا۔ یہاں کا بچہ بچہ جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ فتنہ کا خیال کر کے اور سمجھ کر کہ بستی ویران ہو جائے گی۔ حاکم قندھار نے ادب کے ساتھ گذارش کی۔ کہ یہاں سے جلد از جلد تشریف لے جائیے۔ ورنہ قانونی کاروائی کرنی پڑے گی اور قندھاریوں کو ساتھ نہ لے جانا۔ سید صاحب نے حکم کی تعمیل کی۔ مگر باوجود منع کرنے کے دو سو ستر قندھاری ان کے ہمراہ ہو گئے۔

کابل میں ۴۵ دن قیام رہا۔ امرار کابل کا اختلاف دُور کرنے کی بے انتہا کوشش کی۔ مگر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چاہتے تھے۔ کہ کابلیوں کو جہاد کے لئے آمادہ کریں۔ اور یہاں والوں میں خود بھی جہاد کا شوق تھا۔ مگر قدسی جماعت کی قلت و بے سرو سامانی دیکھ کر ان کے قلوب افسردہ ہو گئے۔ کابلیوں کا حمایت پر آمادہ نہ ہونا قابل نیک نہیں ہو سکتا۔ ان کے اتحاد نہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کابلی حنفی فقہ کے قائل تھے اور مجاہدین کا عمل نجدی و یمنی طریقوں پر تھا۔ اگرچہ سید صاحب نے یقین دلایا کہ وہ حنفی فقہ کے پابند ہیں۔

غرض دس مہینے کے سفر کے بعد جب چارسدہ دہشت نگر میں قدم رنجہ

فرمایا تو وہاں والوں نے جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ تبرک سمجھ کر سید صاحب کے اونٹ کی زین پوش کا تار تار کھینچ لیا۔ اونٹ کی دم کے بال توڑے اور اس کے قدموں کے نیچے کی خاک سینہ و پیشانی پر لگائی (گویا یہاں کے لوگ مشرکانہ رسوم کو عین ایمان سمجھتے تھے سید صاحب معترض نہیں ہوئے)۔

۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ / ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد کی بسم اللہ اکوڑے کے شبخون سے ہوئی۔ اس کے بعد سب سے پہلے خادی خان سردار ہنڈ[1] پھر اشرف خان رئیس زیدہ نے بیعت جہاد کی۔ پھر تو یک بیک مجاہدین کی تعداد پانچ ہزار ہوگئی۔ خادی خان کی درخواست پر ہنڈ کو اپنا مرکز بنایا۔ اب ہنڈ والوں نے مشورہ دیا کہ حضرو کے بازار کو لوٹ لیا جائے سید صاحب نے جواب دیا کہ اکوڑے میں ہمارے بہت سے غازی شہید و مجروح ہوگئے ہیں (۳۶ یا ۳۷) اس لئے ہم معذور ہیں پھر ہمارے ساتھی یہاں کے نشیب و فراز سے بھی واقف نہیں ہیں۔ البتہ تم لوگوں کو اجازت ہے۔ چنانچہ ملکیوں نے چھیالیس قندھاریوں کے ساتھ چھاپہ مارا۔ جب صبح ہوتی تو ملکی مال لیکر واپس آرہے تھے۔ اور قندھاری مال کے لئے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دریائے نالہ تک پہنچے تھے کہ پانچ سو سکھ آگئے۔ ملکی فیصلہ نہ کرسکے کہ لڑیں یا مال کو بچائیں۔ سراسیمگی میں بھاگیں بھی کیسی۔ اور مال بھی نہ بچ سکا۔ جب ان کو بچانے کے لئے مدد بھیجی جس میں بلا اجازت پچاس ہندوستانی غازی بھی شریک ہوگئے تھے۔ تو ان کی صورت دیکھ کر سکھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ بچے ہوئے مال کی تقسیم پر ملکی کسی طرح راضی نہیں ہوئے اور شرعی تقسیم کو نہیں مانا۔ گویا بیعت جہاد بے اثر نکلی۔ اس قسم کی خامیاں دیکھ کر بہ غور و خوض کے بعد نظم جمعیت کی خاطر ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء کو ہنڈ کے تالاب کے کنارے سید صاحب امیر منتخب کئے گئے۔ یہ امارت محض تنظیم جہاد کے لئے تھی۔ ریاستوں کے

[1] سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۱ھ میں جے پال والئے لاہور کو ہنڈ کے مقام پر شکست دی تھی۔

انتظام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ میدانِ جہاد سے نکل کر ہر مجاہد آزاد تھا۔ یہ امارت باہمی اختلافات ختم کرنے کے لئے تھی مگر پردۂ امارت کے اندر مختلف قسم کے اختلافات نے پرورش پائی اور آخر میں رنگ لائے۔ ابھی فتح خاں رئیس پنجتار نے بیعت امارت کی، اور سلطان محمد خان اور دیگر رؤسائے پشاور نے بھی بذریعہ خط بیعت امارت قبول کی۔ سید صاحب کو اُسی وقت بتا دیا گیا کہ پشاور والے قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ حالانکہ کابل کے سفر و قیام میں سید صاحب کو اسی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ بہرحال دو ماہ کے اندر دو لاکھ مجاہدین مہیا ہو گئے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ نوشہرہ جا کر سکھوں پر حملہ نہ کیا جاتا۔ چنانچہ شیدو کے مقام پر جنگ ہوئی۔ رات کے کھانے میں سید صاحب کو زہر دے دیا گیا۔ رات بھر بے ہوشی میں قے کرتے رہے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اگرچہ معمول تھا کہ نصیحتیں سننے کے لئے ہر رات کو مجاہدین پلنگ کے قریب بیٹھتے تھے اور تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ صبح کو میدان میں لے جانے کے لئے شاہ اسمٰعیل آئے تو یہ حال دیکھا۔ اسی حالت میں ہاتھی پر سوار کر کے انہیں میدانِ جنگ میں لے جایا گیا۔ سید صاحب کے پہنچتے ہی درانیوں اور سمہ والوں نے منہ موڑ لیا۔ اور فتح شکست سے بدل گئی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر سید صاحب کو چندلئی لے جایا گیا۔ ساتویں دن جب ان کو ہوش آیا تو فرمایا:

"یہ سب کچھ میری خطاؤں کی وجہ سے ہوا۔ اس تکلیف کے بعد اللہ جل شانہٗ بہت راحت دے گا۔"

یہ صحیح ہے کہ یار محمد خاں نے دشمنوں سے سودا کر لیا تھا لیکن یہ سودا مجاہدین سے اُمید بر نہ آنے کی صورت میں ہوا ہوگا۔ اگر مجاہدین اس کو خوش رکھتے تو یار محمد عہد نہ توڑتا۔ ممکن ہے کہ اس اختلاف میں مذہبی اختلاف بھی جزوِ اعظم ہو۔ تندرست ہو کر سید صاحب نے سوات و بونیر کا دورہ کیا۔ مختلف سرداروں کو

دعوتِ جہاد دی، ان کے اختلافات دور کر دیئے حتیٰ کہ اعمال کی اصلاح کی۔ دینی ذوق میں بالیدگی ہوئی۔ اب یہاں سے جہاد کی تبلیغ اور چندہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کو داعی بھیجے۔ دو ماہ کے بعد اوائل ذوالحجہ میں مولوی عبدالحی کے دہلی سے آنے کی خبر سنی تو سید صاحب پنجتار پہنچے۔ درہنڈ کی بجائے پنجتار کو مرکز بنایا۔ ہنڈ والوں سے چند سرداروں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور وہ ہنڈ جا کر سید صاحب سے ملنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی غرض سے مرکز کو تبدیل کرنا ضروری سمجھا۔ مگر فطرتاً یہ تبدیلی بڑے نقصان کی بیخ اندر رکھتی تھی اور خادی خان پر یقیناً ناگوار ہونا چاہئے تھی۔ بہرحال سید صاحب کی دعوتِ جہاد کی قبولیت و پذیرائی کا یہ شاندار دور تھا۔ ہندوستان سے بھی قافلے آنا شروع ہو گئے۔ اہلِ ہزارہ نے بھی دعوت قبول کر لی تھی۔ ہزارہ سے سکھوں کو کاٹ دینے کی تیاری کی۔ اس جنگ میں پائندہ خاں بس سب شریک نہیں ہوا اور فتح خاں نے عین حالتِ جنگ میں ساتھ چھوڑ دیا۔ لہٰذا شکست سے سابقہ پڑا۔ شبخون ڈمگلہ اور شنکیاری کے بعد مولوی محبوب علی شریکِ جہاد کے لئے دہلی سے آئے۔ درمیان میں یار محمد خاں نے راستہ روک دیا۔ تو بڑی مشکل سے سید صاحب نے انہیں پنجتار لانے کا انتظام کیا۔ مولوی محبوب علی صاحب فہم و ذکا تھے تمام کیفیت و حالت کا اندازہ کر لیا۔ اصلاح کی تدبیریں بھی کوشاں رہیں مگر ان کی نہیں سنی گئی۔ آخر کو دل برداشتہ ہو کر انہوں نے واپسی کی ٹھیرائی بہت سے مجاہدین یہاں کی حالت سے تنگ آ چکے تھے وہ بھی مولوی محبوب علی کے ہمراہ واپس ہوئے۔ یہ کہنا کہ مولوی محبوب علی تنگ مزاج تھے اور تکلیف برداشت کرنے کے عادی نہ تھے محض افترا ہے۔ اس کے بعد اپنے نقص و کمزوری کو محسوس کر کے سید صاحب نے پھر دورہ کرنا

لے۔ سفرِ جہاد میں اجمیر سے کسی خاص کام کے لئے مولوی عبدالحی کو دہلی بھیج دیا گیا تھا لہٰذا وہاں سے واپسی اب ہوئی۔

شروع کیا اور عرصہ تک خیبر میں مقیم رہے۔ یہیں ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء کو مولوی عبدالحی کا انتقال ہوا۔ غازیوں کے زہد و تقویٰ سے ہر شخص متاثر تھا۔ عورتوں کا کہنا یہ تھا کہ سید بادشاہ کے ساتھی خلفشا خواہشِ نفس سے محروم ہیں یا اولیا ہیں۔ یار محمد خاں کی منافقت پر اس کے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ آمازئی کی جنگ میں جب درانیوں سے مقابلہ ہوا، تو رئیس آمازئی نے دھوکہ دیا اور مجاہدین کو شکست برداشت کرنا پڑی۔

مولوی محبوب علی کی عظمت و وقعت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی واپسی پر ہندوستان سے مدد جانا بند ہو گئی اور ان افواہوں کی قلعی کھل گئی کہ سرحد میں سید صاحب کی سینگ کھڑی ہوتی ہے۔ دوبدو جنگ میں سکھوں کی توپوں کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ لاہور کی جامع مسجد میں عیدکی نماز پڑھیں گے۔ اور فلاں تاریخ کو امیر المومنین کے ہاتھ سے رنجیت سنگھ مارا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو فتویٰ تیار ہوا تھا، اس پر دستخط کرنے سے مولوی محبوب علی نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے صلہ میں انگریزوں نے ان کو جاگیر دینا چاہی، مگر مولوی محبوب علی نے انکار کر دیا۔ کہ وہ میری شرعی رائے تھی میں کسی انعام کا مستحق نہیں۔ ایسے شخص کو ہمل بتانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس زمانہ میں جبکہ ہندوستان سے مدد پہنچنا بند ہو گئی تھی۔ سید صاحب کی تفصیل یہ ہے کہ انہیں تنخواہ دار فوج رکھنا پڑی تھی، اور مجاہدین ڈھونڈھے نہیں ملتے تھے۔ آخرکار شاہ محمد اسحاق نے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور جانشین تھے۔ مدد کو جاری کروایا تو سید کے دم میں دم آیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ محمد اسحاق اس تحریک جہاد کے معین و معاون تھے۔ محض دہلی سے چندہ جمع کرنے کے ایجنٹ ہی نہیں تھے۔ مولوی عبدالحی کو بھی غالباً شاہ محمد اسحاق سے کچھ خلش تھی۔ یعنی ان کو نظر انداز کر کے دوسرے داماد کے صاحبزادے محمد اسحاق کو شاہ صاحب نے اپنا جانشین بنایا تھا۔

یہی خلش شاہ اسمٰعیل سے رفاقت کا باعث ہوئی مگر وہ حلیم الطبع تھے۔ اپنے قلبی صدمہ کو انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن غضب ہے کہ مولوی عبدالحی کے انتقال کے بعد شاہ محمد اسحاق جیسے ہمدرد سے بھی علیحدگی اختیار کر لی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ شاہ اسمٰعیل بھی شاہ محمد اسحاق سے اپنے قلب میں کچھ ملال یا رقابت رکھتے تھے۔ لہٰذا مرکز سے رشتہ توڑ لیا گیا۔ ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیعت امارت کے باوجود سب تدبیریں الٹی ہو گئیں اور بری گت بن گئی۔ تقریباً دو برس کے بعد نیا نسخہ ۲۵ شعبان ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء کو بیعت اقامت شریعت کا ایجاد کیا گیا واقعی ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ بیعت امامت نے سید صاحب کو نظم و نسق کے لئے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ اب نئی اقامت شریعت کی بیعت نے احکام شرعی نافذ کرنے کا مجاز بنا دیا۔ گویا حکومت الٰہی قائم کی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاد کا رخ سکھوں کی طرف سے ہٹ کر مسلمانوں کی طرف توجہ و کوشش کی گئی۔ ورنہ کام حکومت الٰہی کی تقویت پر ہو سکتا تھا۔ سب رؤسا اور غربا پر شرع کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ محتسب مقرر کئے گئے۔ قاضی بنائے گئے۔ مقدمات کا فیصلہ شرعی قانون سے ہونے لگا۔ اور منکروں اور مجرموں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ منفعل ذہنیت کی وجہ سے شرع خود رسمی ہو کر رہ گئی تھی۔ بہرحال اب نیند موزہ کشیدہ کے اصول پر ایسا کام چلایا کہ تاریکی چھٹ گئی اور اسلام کا نام چمکنے لگا۔ چنانچہ قصبہ مانیرہ کے قضیہ کو بڑی خوبی سے قطعی شرعی اصول پر صحیح طور پر طے کیا گیا۔ نوے برس ہوئے تو مانیرہ کے اصلی باشندوں کو نکال کر غاصبوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب اتنی پشتوں کے بعد قضیہ اٹھا۔ اصلی باشندوں کے مددگار اشرف خاں اور غاصبوں کے حامی خادی خاں تھے۔ شرعی فیصلہ ہوا کہ اصلی باشندوں کو حق دلایا جائے۔ جب قاضیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم

کرنے سے انکار کیا تو بزورِ شمشیر تعمیل کرائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشرف خاں اور خادی خاں میں ٹھن گئی اور جنگ کی نوبت آئی۔ یہ شرعی فیصلہ یہاں کے ماحول میں باعثِ عناد ثابت ہوا۔ ان احکامِ الٰہی کو غلط طریقہ اور غلط جگہ استعمال کیا۔ خادی خاں نے شکست دیکر اشرف خاں خوشی میں اتراتے ہوئے گھوڑے پر واپس آرہے تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ راکب و مرکوب دونوں گر پڑے اور اشرف خاں جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد ان کی وراثت کا مسئلہ پیچیدہ ہوگیا تھا۔ خادی خاں اشرف کے لڑکے مقرب خاں کے موافق تھے کیونکہ وہ اُن کا بہنوئی تھا اور وہ اس کے بہنوئی تھے۔ سیّد صاحب نے دوسرے لڑکے فتح خاں کے حق میں فیصلہ کیا اور اس کو ہی وارث بنا دیا۔ خادی خاں اس پر علانیہ منحرف ہو کر سکھوں سے جا ملا اور جنرل ونتورا سے عرض کردیا کہ ماہیر خالصہ کی ملکیت ہے۔ آپ کو اس کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ ملکیت خدا کی ہے۔ اور خدا والے ہونے کی وجہ سے ہمیں پورا حق حاصل ہے۔ ونتورا منہ کی کھاکے واپس چلا گیا۔ اٹک کے مسلمانوں نے عرض کیا کہ سکھوں سے ہماری بھی گلو خلاصی کروائی جائے۔ تجویز یہ ٹھہری کہ سیّد صاحب کے مجاہدین برات کے جلوس کی شکل بناکر شہر اٹک میں داخل ہوں۔ پھر مل کر ان کی مدد کریں۔ اور قبضہ کرلیں۔ اتفاق سے برات کا راز فاش ہوگیا۔ اور غازیوں کو ذلت اٹھانا پڑی۔ شرعی احکامات کے یہ نتائج دیکھ کر پنجتار میں ۶۔ فروری ۱۸۲۹ء کو علماء کا شاندار اجتماع ہوا۔ اس میں طے ہوا کہ امام کی اطاعت ضروری ہے۔ انکار کرنے والا باغی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے لیکن اصل بنائے اختلاف پر توجہ نہیں کی گئی۔ رات کو مفاہمت کے لئے خادی خاں سے سیّد صاحب نے گفتگو کی کہ آج مجلس علماء کے فیصلہ سے ناراض ہو کر آپ چلے گئے تھے۔ آپ کو نہیں چاہئے کہ علماء کی حکم عدولی کریں۔ اس نے جواب دیا کہ "ان ملاؤں کی گذر ہماری خیرات پر ہے۔

اور وہ ہمارے تابع ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو خبر نہیں کہ سیاسی معاملات کیا ہیں۔ اپنے کاروبارِ ریاست کو ہم ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مجھے اپنی جہالت کا اقرار ہے، مگر کیا کروں کہ آپ کی عجیب باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں "

علماء کی تقریر سن کر سید صاحب کو غصہ آگیا اور گفتگو ختم ہو گئی اور مفاہمت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد پنجتار میں جنگ ہوئی۔ آدھے سے زیادہ غازی درانیوں اور خادی خان سے ساز کر گئے۔ اور مجاہدین کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ جنگ ۵ محرم ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۹ء کو ہوئی تھی۔ بعد میں مجاہدین نے صفر ۱۲۴۵ھ میں ہنڈ پر حملہ کیا۔ غازیوں کی فتح ہوئی۔ ایک گولی نے خادی خان کا کام تمام کر دیا۔

خادی خان کے اختلاف اور قتل کے متعلق یہ روایت درست ہے جو سید صاحب کے تذکروں کی روایت مختلف ہے ورنہ شاید معتبر و مستند بھی ہو۔ سوات کے حضرت آخون صاحب مشہور و معروف بزرگ تھے (د ۱۲۶۵ - ۱۳۰۰) تبلیغ و تعلیم کے ساتھ ساتھ رسومات بد کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ عقد بیوگان کو رائج کرنے کی کوشش فرماتے تھے وہ نہ صرف عالم و صوفی تھے۔ بلکہ جہاد بالسیف بھی کیا کرتے تھے۔ ان پریشانیوں کی وجہ سے جب سید صاحب نے سوات و بنیر کا دورہ کیا تھا تو آخون صاحب نے ان کی معاونت کی تھی اور سکھوں کو پشاور سے نکالنے میں وہ شریک تھے[1] مگر جب عقائد کا مسئلہ آیا تو سید صاحب کی جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ اور سید صاحب کی جماعت کے عقائد کا رد کر کے مخالفت کی۔ ان کے بے شمار خلفاء میں سے پشاور کے مولوی میاں نصیر احمد صاحب المعروف بہ میاں نصنہ خوانی نے تقویۃ الایمان کی تردید میں "احقاق حق" عربی میں لکھی تھی[2]

---

[1] صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ بجائے فتح پشاور کے بقیہ دوسرے مرکوں میں شرکت رہی ہو۔ فتح پشاور سے پہلے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔

[2] تذکرہ علماء و مشائخ سرحد ص ۱۵۲، ۱۵۱۔

اسی طرح ابتدا میں بحرالعلوم حافظ محمد عظیم رشتہ (۱۲۷۵ھ) مع اپنے شاگردوں اور معتقدین کے سید صاحب کے شریک کار بن گئے تھے۔ اس وقت شیخ المشائخ سید غلام صاحب المعروف بہ "آغا میر جی" نے گور کٹھڑی میں سید صاحب کی جماعت کی دعوت بھی کی تھی۔ اس طرح کہ مجاہدین کو ڈنبے، چاول، گھی، مصالحہ اور لکڑی غرض سب سامان دیدیا تھا۔ اور ہر ایک نے خود پکا کر کھایا تھا لیکن پھر ان صاحبان نے بھی مذہبی و سیاسی اختلافات کی بنا پر سید صاحب کی جماعت سے جُدائی اختیار کر لی تھی۔ مولٰینا غلام رسول مہر صاحب نے "اسمٰعیل شہید جلد دوم کے ص ۲۸۱" [1] میں لکھا ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں۔ جو پشاور کے دس علماء کے نام لکھے گئے تھے۔ پہلا خط ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء اور دوسرا ۱۱ اپریل ۱۸۳۰ء کو بھیجا گیا تھا ان علماء کی خوبی و تعریف کا جناب مہر صاحب نے اعتراف بھی کیا ہے۔ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب اور انکے رفقاء پر حسب ذیل الزام لگائے گئے تھے:۔

(۱) سید صاحب اور ان کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہے۔ نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذت جسمانی کے جویا۔

(۲) وہ ظلم و تعدّی کے خوگر ہیں۔

(۳) مسلمانوں کے اموال و نفوس پر بغیر کسی شرعی وجہ کے دست درازی کرتے ہیں۔

(۴) سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسمٰعیل وغیرہ نے انہیں مہدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے انہیں اپنے ملک سے نکال دیا۔

(۵) وہ مکہ معظمہ پہنچے۔ وہاں سے براہ مسقط و بلوچستان قندھار پہنچے۔

(۶) خادی خاں کو آخون صاحب صوات کے ذریعہ صلح کے بہانے بلایا اور قتل کروایا۔

(۷) وہ افغانیوں کی لڑکیوں کو جبراً (جدید الاسلام) ہندوستانیوں کے حوالے

---

[1] سید احمد شہید جلد دوم ہونا چاہیئے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے کہ یہ الزامات کہاں تک درست ہیں۔ مگر ثابت ہوتا ہے کہ پشاور کے علماء کرام نے ان صاحبان سے اختلاف کیا اور یہ اختلاف معمولی نہیں تھا بلکہ بنیادی اختلاف تھا۔

ان الزامات کے متعلق بادی النظر میں یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ نمبر ۱ میں بوجہ اختلاف ایسی بات لکھی گئی ہے۔ کچھ سہی مگر مسلک اُن کا ضرور تھا۔ نمبر ۲ اور تین کے متعلق یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل کی تیزی و غصہ اور رفقاء کی سخت مزاجی و تعصب کی وجہ سے یہ شہرت ہوئی۔ مگر ان تینوں مقامات میں سید صاحب کو مستثنےٰ کرنا تھا نمبر ۴۔ ۵ میں افواہ جو سُنا تھا وہ لکھا گیا ہے اور تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی نمبر ۶ بات کے متعلق صحیح ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرزا حیرت نے حیات طیبہ میں مختلف تذبذبوں سے اسی قسم کی باتیں ہندوستانی غازیوں کے متعلق لکھی ہیں۔ اور مہر صاحب نے خود اقبال کیا ہے کہ جب ایک عورت نے دوسری عورت کو طعنہ دیا کہ تیرا شوہر کالا ہے (کیونکہ اس جماعت میں حاجی شریعت اللہ والے بنگالی زیادہ شامل تھے) تو سید صاحب نے طعنہ دینے والی عورت کو سزائے تازیانہ دی تھی۔ سوانح احمدی کے خط نمبر ۴۴ میں سید صاحب نے علمائے پشاور کو لکھا ہے کہ ہمارے متعلق غلط باتیں آپ کے یہاں بیان کی جا رہی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے۔ صرف خدا کو مانتے ہیں اور مخالفت و موافقت مخلوق کا لحاظ نہیں رکھتے اور ان کی مدح و ذم کو ایک برابر سمجھتے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ ہم حنفی ہیں۔ اگر ہم کسی مسئلہ کی مختلف تاویل کرتے ہیں۔ تو خارج از مذہب نہیں ہو سکتے۔ غلط ہے۔ کہ ہم نے کسی پر ظلم کیا ہے۔ البتہ مرتدین و منافقین کو سزا دی ہے۔ ہمارے متعلق جو شکوک ہیں ان پر ہم سے یہاں آکر

---

(۱) تذکرہ علماء و مشائخ سرحد صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴۔

مناظرہ کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ۔ یہ خط ایک معقولی منطقی ہی لکھ سکتا ہے۔ البتہ سید صاحب کے نام سے لکھا ہے اور وہ اس کے مضمون کے غوامض کو نہیں سمجھے اور مغالطے کو واضح طور پر نہ سمجھ پائے۔ مد نمبر ۶ ایک نئی بات ہے اور اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ راویانِ سید صاحب میں اختلاف سہی۔ مگر مدعا سب کا ایک ہے۔ خادی خان کے اختلاف کی تفصیل ان ہی کی زبانی ہے کہ :۔

(۱) بیعت اقامت شریعت ۷۔ فروری ۱۸۲۹ء کو لی گئی۔[1] اس موقع پر فتح خاں نے نے اپنی تقریر میں لکھا تھا کہ آپ ہی نے ہمیں صوات سے ملایا ہے۔ لہٰذا شرعی احکام قبول فرمائیے۔ پھر فتح خاں نے کہا کہ ان کو راضی کرنا میرے بس کی بات نہیں مگر میں حاضر ہوں۔ سب ملاؤں نے اس فتوے پر دستخط کر دیئے۔

(۲) اصلاح عام کے لئے ۲۰۔ فروری ۱۸۲۹ء کو اجتماع ہوا اور اشرف خاں۔ فتح خاں اور خادی خاں نے بیعت کی تجدید کر کے رضامندی دی۔

(۳) مانیر کا قضیہ پیش آیا۔ آخر کار سید صاحب نے لڑائی کا حکم دیدیا۔ اور اشرف خاں و فتح خاں اس میں شریک تھے۔ تو اہل مانیر نے زمین واپس کر دی اور سلسلہ کشت و خون بند ہو گیا۔ اسی قضیہ میں جب ایک فریق کا طرفدار ہونے کی وجہ سے خادی خان کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اسلئے سید صاحب اور خادی خان میں اختلاف ہو گیا۔ اور وہ تحریک کا دشمن بن گیا۔

(۴) جب سید صاحب شہر پہنچے تو خادی خان نے کوئی عقیدت کا خط نہیں لکھا۔

(۵) بیعت اقامت شریعت میں بلایا گیا تو وہ شریک ہوا اور اس نے اطاعت کی مگر بعد کو واقعہ مانیر کی وجہ سے بگڑ بیٹھا۔ یعنی جاہلانہ رسوم پر قائم ہو گیا۔

---

[1] اس وقت دہلی کا ریذیڈنٹ۔ ایڈورڈ کولبرک تھا۔ پھر فرانسیس ہاکنس ستمبر ۱۸۲۹ء سے ہوا ہے اور مارٹن ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۲ء تک۔

(۶) خادی خاں کے انحراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے آنے والوں کو دِق کرنے لگا۔ مانیرے سے اس کی شکایتیں آئیں۔ جب سیّد صاحب خہرہ میں تھے تو اشرف خاں نے خادی خاں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ شاہ اسمٰعیل لشکر کے ساتھ بھیجے گئے کہ فیصلہ کرائیں۔ مگر معلوم ہوا کہ اشرف خاں زیدہ کو واپس جا رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ خادی خاں نے لشکر کا ہمیں دفاع کرنا پڑا۔ وہ بھاگ گئے اور ہم واپس آ گئے۔

(۷) اشرف خاں اس فتح پر خوشی منا رہا تھا کہ گھوڑے سے گرا۔ اور جاں بحق ہو گیا۔ اس کے جنازہ میں خادی خاں شریک ہوا۔

(۸) اشرف خاں کے تین بیٹوں میں جانشین کا مسئلہ درپیش تھا۔ فتح خاں زیادہ لائق تھا۔ اشرف خاں اس کا طرف دار تھا۔ لہٰذا اسی کے دستار دراثت بندھوائی گئی۔ خادی خاں کو اس فیصلہ سے اختلاف تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ مقرب خاں کو سردار بنایا جائے۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہنوئی تھے۔ لہٰذا خادی خاں کو اختلاف کی مزید وجہ پیدا ہو گئی تو اس نے سکھوں سے سازش کی۔ وہاں کے حاکم نے دنتور اور مانیرے کے فیصلے کے متعلق سید صاحب کو خط لکھا اور سید صاحب نے منہ توڑ جواب دیا۔ پھر مولوی خیر الدین کو تین سو غازیوں کے ساتھ پنجتار کے دفاع کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ غازیوں کے شبخون مارنے کی خبر سن کر سارا سامان چھوڑ کر دہشت میں دنتور واپس چلا گیا۔

(۹) اٹک کے واقعہ کے بعد پنجتار میں مجلس شوریٰ ہوئی۔ فتح خاں نے سمہ والوں کو شرکت کیلئے بلایا۔ سید صاحب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خادی خاں کو راہ راست پر لایا جائے۔ اگر وہ نہ مانے تو علماء سے اس کے خلاف فتویٰ لیا جائے۔ سید صاحب نے تقریر فرمائی۔ حقیقت ہجرت بیان کی کہ آپ نے ہمیں جگہ دی بیعت امامت

---

۱۵ غالباً ایمی حیات میں مدسنہ اشرف خاں کا نام اس موقع پر غلط درج کیا ہے۔

آپ کے مشورے سے جہاد کیا۔ آپ اب دستکش ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔
اب آپ اسمٰعیل کی تقریر سنیں۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ باغی کی سزا قتل ہے۔
اور اس فتوٰی پر آپ مہریں لگائیں۔ خادی خان مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ عصر کے
بعد مہمان چلے گئے۔ ٹھیرنے والوں میں خادی خان بھی تھا۔

(۱۰) رات کے وقت سید صاحب نے خادی خان سے بات چیت کر کے اسے سمجھانا چاہا
مگر اس نے علما کی مذمت کی۔ انہیں ناواقف و جاہل کہا۔ بایں وجہ کہ انہیں کاروبارِ
ریاست کا کوئی شعور نہیں تو سید صاحب نے دماغی توازن بگڑ جانے کی وجہ سے
سکوت اختیار کیا اور صبح کو خادی خان کو رخصت کر دیا۔ (ان سوال و جواب
میں مہر صاحب نے وقائع و منظورہ کی سند پیش کی ہے)۔

(۱۱) دنتورا دوبارہ آیا۔ خادی خان اس کا معاون تھا۔ خادی خان چاہتا تھا کہ مقرب
خان کو سردار زیدہ بنایا جائے اور اس کے حلیفوں کا مانیر پر قبضہ ہو جائے۔
غازیوں نے مدافعت کی اور حملہ کیا۔ دنتورا بھاگ گیا اور خادی خان پر غلط
مشورہ دینے کی وجہ سے عتاب کیا۔ مانیر والوں نے خادی خان کو زک دی۔

(۱۲) سید صاحب کو خادی خان کی مخالفت میں تامل تھا چنانچہ خادی خان کو ہنڈ
سے پنجتار بلایا جب وہ نہیں آیا تو ملاقات کی ٹھیری۔ شاہ اسمٰعیل ملاقات کو گئے
اور سید صاحب کو نہیں جانے دیا۔ نتیجہ ملاقات یہ ہوا کہ اس نے سید صاحب کو
دُنیادار ثابت کیا۔ اور سید صاحب کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا۔

(۱۳) جنگ پنجتار کی کامیابی کی وجہ سے لوگوں کو سید صاحب کی بیعت کا شوق بڑھا۔
مگر سرداران پشاور اور خصوصاً یار محمد خاں اور خادی خان حائل و مانع ہوئے
لہذا ہنڈ پر حملہ کرنے کی ٹھیری۔ نئی ترکیب سوجھی یعنی ۲۵ غازی قلعہ کے
دروازے کے قریب رات کو پہنچ کر چھپا دیئے گئے اور حکم دیا کہ صبح کو دروازہ

کھلے تو قلعہ میں داخل ہو جائیں، اور خادی خان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ اتفاقیہ ایک گولی کی زد میں خادی خان آگیا اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ۱۰ صفر ۱۲۴۵ھ کا یہ واقعہ ہے۔ مگر اس کا مال و زر خدا جانے کہاں گیا۔ ایک حبّہ[۲] نہیں ملا۔ اور سید صاحب نے خبر سن کر اس کے اہل و عیال کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔ مقرب خاں تیبیں زید سید صاحب کا عقیدت مند تھا۔ اور خادی خان سے دوسرا رشتہ رکھتا تھا اس کی رائے یہ ہوئی کہ خادی خان کی ریاست خادی خان کے بھائی امیر احمد کو دے دی جائے۔[۱]

واقعات جو لکھے گئے ہیں وہ پیش کر دیئے گئے۔ خادی خان کی برگشتگی کے جو وجوہات بتائے گئے ہیں۔ ان میں کچھ شائبہ خوبی تحریر بھی ہے۔ اسی وجہ سے ان متذکرہ بالا وجوہات پر مختصر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ اگر خادی خان کو مرکز کی تبدیلی کا ملال تھا تو اس کی عقیدت مندی کا قائم رہنا تعجبات سے ہے اور پھر بیعت اقامت شریعت میں شریک ہونا بھی تعجب کرنے کو کافی ہے۔ انکے واقعہ کے بعد پنجتار میں جو مجلس شوری ہوئی۔ اس کے نتیجہ کو دیکھ کر خادی خان نے قطعی طور پر سید صاحب کی مخالفت کا اعلان کیا ہے۔ اور اس کے بعد کوئی ٹانکا جڑا نہیں رہا۔ مگر سید صاحب کی سیادت و رحم دلی اس سے بار بار راہ راست پر آنے کے لئے اصرار کرتی ہے۔ اور آخر کار عجیب خبطی سے وہ گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کہ بیعت اقامت شریعت کے موقع پر یا اس کے بعد والی مجلس شوری میں شاہ اسمٰعیل نے عدم وجوب تقلید پر گل فشانی کی تھی جس پر سید صاحب نے خود انہیں[۲] تہدید فرمائی تھی کہ یہ وقت فروعی لغویات میں پڑ کر افتراق پیدا کرنے کا نہیں ہے۔ غالباً اسی[۳] قسم کے عقائد کو سن کر علمائے پشاور اور خصوصاً حضرت آخوند صاحب نے تعلقات منقطع کئے ہیں۔ ان دونوں مواقع کی تاریخیں ۶ فروری اور ۲۰ جنوری ۱۸۲۹ء ہیں۔ اور ادھر شاہ اسمٰعیل کے پہلے[۲] خط بنام علماء سرحد کی تاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء ہے لہذا

یہ اختلاف ان ہی تاریخوں میں مانا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو خادی خاں کی عقیدتمندی ان تاریخوں سے پہلے ختم ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ خادی خاں حضرت آخون صاحبؒ کا مخلص مرید تھا اور اس حقیقت کا ثبوت "تواریخ ہزارہ" میں صاف صاف موجود ہے لہذا سید صاحب سے خادی خاں کا انحراف اخون صاحب کے اتباع کی وجہ سے ہوا۔ اور مانیری کے قضیہ میں اسی انحراف کی وجہ سے خادی خاں نے مخالفت کی اور سید صاحب کی درخواستوں کو اسی لئے قبول نہیں کیا۔ لہذا امدات نمبر ۸ اور نمبر ۹ کیسی ہی ہوں۔ اُن کو اس انحراف کی وجہ سے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب نے خادی خاں سے سمجھوتہ کرنے کے لئے اخون صاحب کی معرفت کوشش کی ہو، اور اخون صاحب کے کہنے سے ہی صلح کے لئے آیا ہو۔ بہر حال یہ بات ہر طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ خادی خاں بے خبری میں فریب سے مارا گیا تھا۔ اس کی صورت یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ صلح کی گفتگو کے بہانے اسے قتل کیا گیا، یا فنون جنگ کے اصول پر پچیس آدمی رات میں اس کے قلعہ کے دروازے کے قریب چھپا دیئے گئے اور صبح کو دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہوئے، اور بے خبری میں اس کو ہلاک کر دیا لیکن اگر سید صاحب نے اخون صاحب کا انقطاع کر لینا ان سب واقعات سے پہلے کی بات ہے، تو یہ سمجھا جائیگا کہ سید صاحب کو خادی خان پر اخون صاحب کا مرید ہونے کی وجہ سے اعتبار نہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنا مرکز منشہ سے پنجتار کو تبدیل کیا تھا اگر واقعات اس مفروضہ کی تائید نہیں کرتے۔ البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اشرف خاں اور [illegible] خاں کی خادی خاں سے رقابت اور مخالفت کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ اور کیوں مصالحت کرائی۔ کیونکہ خادی خاں اشرف خاں کا داماد تھا جس کی وجہ سے یہ تمام بلائیں نازل ہوئیں۔

غرض سب کی مرضی کے خلاف خادی خاں کے اہل و عیال کو آزاد کر دیا۔ اور ...

خادی خان کے بھائی کو شاید مقرب خاں کی سفارش پر ریاست جنڈ کا فرمان سید صاحب نے لکھ دیا۔ مگر اسمٰعیل نے اس فرمان کو مسترد کر دیا لہٰذا امیر خاں کے ساتھ مقرب خاں بھی منحرف ہو گیا۔ اور ان سب سے زیدہ میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں یار محمد خاں زخمی ہو کر جانبر نہ ہو سکا۔ غازی اگرچہ کامیاب ہونے والے تھے مگر کسی نے سید صاحب کو غلط خبر دی کہ زیدہ میں غازیوں کو شکست ہو گئی۔ اس لئے ازراہِ دور اندیشی و انجام بینی سید صاحب نے پنجتار کو چلا جانا مناسب سمجھا۔ یہ واقعہ ۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء کا ہے۔ سلطان محمد خاں اب تنہا رہ گیا تھا۔ اس پر بڑی بنی۔ آخر کار وہ بھی سید صاحب کی مخالفت پر مجبور ہو گیا۔ سلطان محمد خاں نے جھنڈ کو فتح کر کے امیر خاں کے حوالے کر دیا۔ سید صاحب نے پائندہ خاں سے ناراض ہو کر عشرہ کوٹلہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد کو اس سے بذریعہ صلح امب لے لیا اور بجائے پنجتار امب کو مرکز بنایا۔ دینی برکات جاری کئے گئے۔ حکومت الٰہیہ کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد پھر پائندہ خاں سے مقابلے ہوئے۔ آخر کار بڑی جاگیر عطا کرنے کے وعدہ پر اس سے صلح کر لی گئی۔ ہری سنگھ نہیں جانتا تھا۔ اس شبہ پر کہ بھیلائے پر شبخون کا ارادہ رکھتا ہے، غازی چڑھ دوڑے۔ تو ہری سنگھ جان بچا کر فوگ دم بھاگ گیا۔

رنجیت سنگھ نے وزیر سنگھ و حکیم عزیز الدین کو پیغام صلح لیکر بھیجا کہ اتنا حصہ ملک انہیں دیا جا سکتا ہے۔ جواب میں سید صاحب نے مولوی خیر الدین شیرکوٹی کی معرفت سفارت بھی جو جا کے رنجیت سنگھ سے دستور اسے ملاقات کر کے واپس آئی۔ سکھوں کے شرائط انہوں نے قبول نہیں کئے۔ اور اپنے شرائط پیش نہیں کئے ورنہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے حق میں مفید صلح ہو جاتی۔ مگر یہاں مرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی کہ سکھوں کو فنا کر کے رہیں گے۔

سید صاحب کا امب پر قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان محمد خاں۔ پائندہ خاں

اور سکھوں نے سید صاحب کی مخالفت پر معاہدہ کیا۔ یہ سُن کر سید صاحب اسب کے مورچوں کی مرمت کروانے لگے اور حملے کے خوف سے شاہ اسمٰعیل کو مکتوب لکھا کر یہاں سے لے جا کر عورتوں اور بچوں کو سُتھانہ پہنچا دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "اگر عورتوں اور خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو امب سے ستھانہ پہنچانے سے شوکت اسلام کو نقصان پہنچا تو اس کیلئے خدا کے یہاں آپ جوابدہ ہونگے۔ یہ بھی یقین رکھئے کہ جب تک سو غازیوں کے سر نہ کٹ جائیں گے۔ خدا نخواستہ آپ کے حرم محترم تک نوبت نہیں آئے گی۔"

سید صاحب نے اس پر تحریر فرمایا کہ میرے بھانجے سید احمد علی کی طرح سچی بات کہنے میں میاں صاحب بھی مراعات ادب کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر مہر صاحب یوں لکھتے ہیں، کہ اس میں مراعات ادب کے خلاف کوئی بات نہیں تھی۔ (سید احمد شہید ط ۲۳۱)

(بہر حال یہ اپنی اپنی سمجھ ہے)۔

غرض پھتی پر تسلط ہو جانے کے بعد سلطان محمد خاں کو سید صاحب نے مفاہمت کیلئے خط لکھا۔ اس نے جواب دیا "تم مصنوعی فقیر ہو۔ ہم نے تمہارے قتل کی ٹھان لی ہے۔ تاکہ یہاں کی زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔"

اس تحریر کے بعد لڑائی ناگزیر ہو گئی تو ہتیار پر سلطان محمد خاں کو شکست دی۔ پھر مردان والوں سے صلح کے ساتھ تصفیہ ہو گیا۔ اس شرط پر کہ لشکر گڑھی کے باہر ٹھیرے۔ اور امیر المومنین گڑھی میں قیام فرمائیں۔ تورو سے جب سید صاحب یہاں آئے تو اس معاہدہ کی انہیں خبر نہیں تھی۔ اسلئے مع لشکر گڑھی میں داخل ہو گئے گڑھی والوں نے شاہ اسمٰعیل سے اس بدعہدی کی شکایت کی۔ تو شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کے پاس جاکر غصہ میں کہا۔

"جناب خود خلاف شرع امر کے مرتکب ہوئے۔۔۔۔ یہ لشکر ہے اسے میدان میں ٹھیرنا چاہیئے۔ پیر زادوں کا قافلہ نہیں ہے کہ قصبہ میں گھس آئے۔"

یہ روایت منظور کی ہے۔ وقائع نے بحوالہ دیگر اسی کی تکرار کی ہے اور لکھا ہے۔ کہ لوگوں کو شاہ صاحب کا انداز پسند نہیں آیا۔ بعد کو مولانا نے معافی مانگی تو سید صاحب نے کہا کہ مجھے معاہدہ کی خبر نہ تھی ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ (سید احمد شہید ص ۳۶۲) یاد نہیں کہ جناب مہر صاحب نے اس کی کیا توجیہ کی ہے۔

مرزا حیرت نے حیات طیبہ میں ہر جگہ شاہ اسمٰعیل کی سعادتمندی اور ادب کی تعریف کی ہے۔ کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف باتوں پر بھی سید صاحب کے غلط احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ خواب یک خواب است اما مختلف تعبیرہا۔

ضرورت ہے کہ ان اختلافات کو دور کر کے صحیح حالات لکھے جائیں۔

قندؔ میں سید صاحب کے دسترخوان پر کھانے کے لئے جو گوشت پیش کیا تھا وہ کچھ جل گیا تھا۔ سید صاحب نے گوشت نہیں کھایا۔ اور دال پر گذر کی۔ ساتھ ہی پکانے والے کو مردود کا خطاب مرحمت فرمایا۔ جب میاں نظام الدین نے ٹوکا تو اقبال جرم کیا کہ بے اختیاری میں یہ لفظ منہ سے نکل گیا تھا۔ اور میاں عبداللہ سے اس کی معافی مانگی۔ (سید احمد شہید)

سلطان محمد خاں کی منافقت کا مزا چکھانے کے لئے پشاور پر حملہ کی تیری اثنائے راہ میں سب لوگوں نے استقبال کیا۔ اور کوئی مانع نہیں آیا۔ ارباب فیض اللہ خاں نے بیچ میں پڑ کر سلطان محمد خاں کا قصور معاف کرا دیا۔ پشاور میں امارت شرعیہ قائم کی گئی اور اسی کے انتظام کے لئے پشاور پھر سلطان محمد خاں کے سپرد کر دیا گیا۔ اگرچہ دنیا بھر اس کے خلاف تھی اور خود بھی اس کو بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ پشاور کا اس طرح انتظام کر کے پنجتار جاتے ہوئے گڑھی امان زئی کے ایک بالاخانہ پر سید صاحب مقیم ہونے تھے۔ ایک لڑکا تحفہ میں پھل لایا تھا۔ اور سیڑھی پر کھڑے ہو کر زیادہ انعام کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ اترنے اور چڑھنے کا راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے شاہ

اسمٰعیل نے اس لڑکے کے کئی طمانچے رسید کئے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وار خالی گیا تو سیڑھی کی ایک کیل شاہ صاحب کی ہتھیلی میں چبھ گئی۔ اور خون نکلنے لگا۔ اتنے میں سید صاحب آ گئے۔ اور خون نکلنے کی وجہ دریافت کی۔ منشی محمد انصاری نے اس واقعۂ جہاد کی داستان سنادی۔ تو ارشاد فرمایا۔ کہ میاں صاحب آپ کا غصہ ان دنوں بہت بڑھ رہا ہے۔ اسے دُور کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد منشی صاحب نے کہا مولانا عبدالحی کو غصہ آتا تھا مگر وہ جادۂ شرع سے نہیں ہٹتے۔ جواب میں شاہ اسمٰعیل نے توجیہہ فرمائی ..... ان کا غصہ آورد تھا ..... اور میرا غصہ آمد ہے جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر غلبہ پالیتا ہے۔ زبان کیا کسی عضو پر بھی قابو نہیں رہتا" مولانا مہر صاحب نے ازراہِ شفقت تاویل فرمائی ہے کہ شاہ صاحب حقانی و ربانی آدمی تھے۔ اس لئے عیوب کا اقرار کر لیتے تھے۔ (سید احمد شہید ص۲۸۵)

اس جواب اور تاویل پر ظرافت کی دیوی اس قدر گدگداتی ہے کہ قہقہہ نکل جاتا ہے، قربانش شوم روزِ محشر پیشِ داور۔ مولانا مہر کی تاویل کام نہ آسکے گی۔ پنبہ کجا کجا نہم :-

ایک مرتبہ سوات والوں سے معاملہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے انہیں سمجھایا۔ مگر انہوں نے یہی جواب دیا۔ کہ اگر ہم پر عشر قائم کیا جائیگا تو ہم گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ارشاد فرمایا کہ امیر المومنین کے حکم سے مجبور ہوں۔ ورنہ از روئے شرع تمہارے انکار پر تم سب کو قتل کر دیتا۔ (سید احمد شہید)۔

پشاور کی فتح کی وجہ سے خیبر سے لے کر اسب تک اثر قائم ہو گیا۔ اب سکھوں کی خبر لینے کا زریں موقع تھا مگر قضاء قدر یا شامت اعمال کا کیا علاج ؟ عمال اور قاضیوں کی نفسانیت بروئے کار آئی۔ عشر کی وصولی کیلئے بیحد سختیاں کیں۔ قاضیوں نے زبردستی شادی شدہ کنواریوں اور بیواؤں کے نکاح پڑھوانے شروع

کر دیئے۔ ایک مرتبہ کسی عورت نے دوسری عورت کو طعنہ دیا کہ تیرا شوہر کالا ہے۔ اس نے سید صاحب سے شکایت کی۔ تو سید صاحب نے طعنہ دینے والی کو سزائے تازیانہ سے نوازا۔ پہلے ان عورتوں کا خیال تھا کہ سید بادشاہ کے غازی اولیاء ہیں۔ اب اس کے برعکس نکلے۔ پختون اس طرح اپنی عزت و ناموس کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سازش کا منصوبہ گانٹھا گیا۔ سید صاحب کو متعدد مرتبہ ہونے والی سازش کی اطلاع دی گئی۔ مگر انہوں نے کان نہیں دھرے۔ آخر کار سید محمد اصغر سدئے کہ دو تین دن میں خود ہی انکشاف ہو جائیگا۔ سید محمد اصغر کا رونا کل صاحب ایمان و باحیا غازیوں کا رونا تھا۔ آخر کار ایک دن پختونوں نے جملہ قاضی و عمال کا بہ اختیار خود پشاور سے عدم آباد کو تبادلہ کر دیا۔

جب پشاور میں یہ واقعہ ہو گیا۔ تو طوطے ہرن ہو گئے۔ عقل کٹ گئی۔ بدحواسی میں سید صاحب کے منہ سے یہ رٹے ہوئے کلمات ادا ہونے لگے۔ ہم ابتداءً یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ وعظ و نصیحت کا نتیجہ نہ نکلا تو حاکمانہ فہمائش کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یہ طریقہ بھی بے اثر رہا۔ جاری کرا اجرائے دین کے سوا ہمارا کچھ مدعا نہ تھا۔۔۔۔ اب ہم وہاں مقیم ہوں گے جہاں صادق القول رل جائیں گے جو سید صاحب کی معصومیت مجبور تھی کہ اپنا شیڈنٹ نہ دیکھے۔ اور دوسروں کو قصوروار بنائے۔ حالانکہ وہ خود ہندوستان سے خوب سوچ سمجھ کر اور واقف ہو کر آئے تھے جیسا کہ بارہا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد ہجرت کا اعلان کیا۔ سب لوگوں کو بیعت سے آزاد کیا۔ جب کچھ لوگوں نے ہجرت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو فرمایا "مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔ جیسے کسی کو ...۔ سے ہو۔ فتح خاں سے کہا "یہ لوگ کلمۂ توحید بھی عادۃً پڑھتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کی دوا کریں۔ تاکہ کلمہ گویوں کی طرف سے شک زائل ہو جائے"

ان الہامی ارشادات کو بھلا فتح خاں کیا سمجھ سکتے تھے۔ وقتِ وداع آخری خطبہ یہ دیا۔ "ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے کہ سید صاحب نے دھوکہ دیا۔" پھر وصیت فرمائی کہ "جدا ہونے والے بھائیوں کو خراسان، ہندوستان یا دوسرے ممالک میں بسنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ عرب کے سوا اور کہیں توطن اختیار نہ کریں۔ اگرچہ بدعات سے ملک عرب بھی خالی نہیں ہے" عادۃً یہ فقرے اور نصیحتیں کہہ کر مآل بینی دخیر خواہی کا بھی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ سب سے آخر میں شاہ اسمٰعیل سے سرگوشی کی کہ "میں صاحب آپ قرآن شریف کی تلاوت کی طرف توجہ فرمائیں اور میں کثرتِ مراقبہ میں مشغول رہوں گا۔ یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں۔ جہاں سے جہاد کا انتظام ہو سکے" (اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے جدید اصول کے مطابق ولائیت انبیاء کی منزل طے کر کے ولائیت اولیاء کے مقام میں داخل ہو گئے۔ العظمۃ للہ۔ عزم مصمم کے بعد کہ جہاد سے توبہ ہے۔ پھر جہاد کا تخیل وسوسے پیدا کرنے لگا۔ یہاں سے روانہ ہو کر دامنِ کوہ میں پہنچے تو ساتھ رہ جانے والوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہشِ نفسانی وغیرہ میں اپنے اوپر مسلمان بھائیوں کو مقدم رکھا جائے۔ اور مقامِ تکلیف میں خود کو مقدم سمجھا جائے (یعنی ولائیت اولیاء میں اس قسم کے ہی مجاہدے ہوتے ہیں) سب ساتھیوں نے بیعت اس امر پر کی مگر شاہ اسمٰعیل نے نے نہیں کی۔ اس واسطے کہ شاید میں نہ نباہ سکوں۔ (اللہ رے مرد مجاہد کی احتیاط اور اس کا حوصلہ۔ کاش کوئی صاحب شریعت شاہ اسمٰعیل کی عاقبت کوشی اور مآل اندیشی پر روشنی ڈالیں)

۵۔ ذی قعدہ کو اتوار کے دن سچوں سے سید صاحب مع اپنی مختصر جماعت کے بالاکوٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ اب ان کی طبیعت میں تغیر واقع ہو گیا۔ تفویض و توکل کا رنگ نمایاں تھا اور تدبیروں سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اتنے میں شیر سنگھ

نے بالاکوٹ کا محاصرہ کر لیا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء ۲۴ ذیقعدہ کو جنگ بالاکوٹ کے دن سید صاحب مسجد زیریں میں تھے۔ یکدم تکبیر کہتے ہوئے چل پڑے دلدل میں چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہے تھے کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر نہ بصارت کو نظر پڑے اور نہ بصیرت کو دکھائی دیئے۔ خدا جانے توپ کا گولہ اڑا لے گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح آسمان پر چڑھ گئے۔ کسی بگڑے دل ساتھی نے تلوار کے گھاٹ اتار کر دلدل میں دبا دیا۔ پھر واپس آنے کیلئے مصلحتاً غائب ہو گئے۔ بالقول پروفیسر فری لونڈ ایبٹ میدان جنگ میں نعش پہچان لینے کے بعد سکھوں نے نذر آتش کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔۔۔ لوگوں کا یہ بھی مقولہ ہے کہ سید صاحب کے ساتھ شاہ اسمٰعیل بھی آسمان پر چلے گئے۔ " کہا جاتا ہے کہ شیر سنگھ نے دونوں کی نعشوں کو دوسرے دن شناخت کر کے بالاکوٹ میں دفن کرا دیا۔ شاہ اسماعیل کی قبر موجود ہے۔ اور سید صاحب کی قبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قبروں کی طرح مشتبہ ہے " (حیات طیبہ) جناب شیخ محمد اکرام صاحب " موج کوثر " کے صفحہ ۲۱ کے نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ " یک نہایت عبرت آموز واقعہ ہے۔ کہ شاہ اسمٰعیل کی قبر پر بالاکوٹ میں لوگ نسوار چڑھا کر منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود تمام عمر قبر پرستی کے خلاف رہے "۔

من وعن حالات وواقعات پیش کر دیئے گئے۔ اب ہر شخص بذات خود نتیجہ نکال لے۔ خاکم بدہن۔ میری آنکھوں میں خاک نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ کہ جہاد نے فساد کی صورت اختیار کر لی۔ مامور ہونے کا دعویٰ غلط۔ انتخاب امارت مشکوک و بے معنی معلوم ہوا۔ کمانڈر انچیف شاہ اسمٰعیل تھے۔ اور سید صاحب محض بگل بجانے والے تھے۔ حیرت ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ہمکلامی چھوڑ دی۔ خواب میں بشارتیں بند ہو گئیں الہام باد ہوائی بن گیا۔ رجال الغیب کی ہمراہ رہنے والی قدوسی جماعت نے رہبری

نہیں کی، حلم کا نام نظر نہیں آتا۔ مختلف قسم کی بیعتیں اور ہر مرتبہ مرکز کی تبدیلیاں اس نہیں آئیں۔ قدرت نے اشارے کئے۔ مگر یہ آنکھیں نہیں کھلیں۔ ضد اور خبط میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ اضافہ ہی ہوا۔ جس قدر دعویٰ قبولیت کیا اسی قدر واقعات نے تکذیب کی۔ نفس کی گل کاریوں نے ہر موقع پر بہار کا نقشہ پیش کیا۔ ان کا اثبات نفی کے معنی رکھتا تھا۔ جہاد سکھوں سے تھا۔ مگر لڑائی پٹھان یا مسلمانوں سے۔ بیعت لینے کے بعد ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ مرشد بن کر حکم چلاتا آیا۔ خدمت کا تصور نہیں پیدا ہوا۔ دعویٰ نفاق دور کرنے کا تھا مگر تشدد سے نفاق میں اضافہ کیا۔ دشمن کو دوست بنانے کے بجائے دوستوں کو دشمن بنالیا۔ اور اسی وصف کو قابل فخر سمجھا۔ فتنوں کو کم کرنا تھا۔ مگر شیطان کی آنت کی طرح دراز کر دیا گیا۔ بقول شاہ ولی اللہؒ "وہ حکیم ہی نہیں جو عوام کو خواہ مخواہ اپنے خلاف کرلے۔" شے لطیف کی کمی نے ایسی بات نہ کہنے دی جو دل میں اتر جاتی۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو سورۂ توبہ پڑھ کر سنا دیتا۔ کاش انہیں غزوۂ تبوک کے حالات کی خبر ہوتی کہ منافقوں کے ساتھ سلوک کیسے کیا جاتا ہے۔ اب کیسے مان لیا جائے کہ ان کی ہر بات صحابہؓ کے اتباع میں ہوتی تھی اور وہ سنت کی پیروی کرتے تھے۔ تالیف قلوب شاید سید صاحب کرنا بھی چاہتے تھے۔ مگر شاہ اسمٰعیل کے دل و دماغ میں اسکی بھنک بھی نہیں پہنچی تھی۔ سید صاحب نے اعلان ضرور کیا کہ ہوس ملک و دولت ہمیں نہیں۔ ہم محض کلمۃ اللہ اور دین کی خاطر لڑتے ہیں۔ مگر لڑائیوں کے جو احوال لکھے گئے ہیں ان سے یہی نقشہ جمتا ہے کہ ویسی ہی لڑائیاں تھیں جیسی جاہل عرب اسلام سے پہلے اور اسلام کے مقابل میں لڑا کرتے تھے۔ اگر سرحدی مسلمانوں کے دلوں پر مہر لگی ہوئی تھی تو ان سے توقع ہی فضول تھی۔ ان سرحدی پٹھانوں پر تبلیغ کا اثر نہیں ہوا۔ اگر صحیح تعلیم دی جاتی تو وہ اپنی جہالت پر قائم نہیں رہتے۔ وہ بھی مسلمان تھے

اور یہ شیخ مسلمان تھے۔ وہ اپنے رسم و رواج کو مذہب سمجھتے تھے انہیں اپنے ذاتی مذہب پر ناز تھا۔ یہ دونوں اپنی اپنی نوعیت سے متحرک تھے، اور فراست سے محروم یہاں دین سے دنیا بھاری تھی، تو مجاہدین کو دنیا پرستی پر بات کا شعور نہ تھا معتقدین کو چھوڑ کر دوسروں پر سر پھوڑنا، ہمیت ... ورنہ ... وہ اپنے ... کی وجہ سے بہرہ مند تھے، اور یہ مرشد بے فیض تھے ... اکابر عقل و دین کو دخل نہ تھا ... کی طرح کا نشاں حکومت انہیں آمدنی ... و ... کام نہیں آئی، وہ ... تھے ... ہم نے ... سے ... کی وجہ سے انہیں ... نہیں بنایا تھا یہ لوگ ... سے بھی سوا ... زیادہ تھے۔ جب فیض کی ... یہاں پہنچا تو ... سے ... حاصل۔ لہٰذا انہوں نے ... دی، اور اس کو جوڑ ... ان کے ... طرح سے جب ... ان ... کی تصدیق کرتی ہیں سید صاحب ... پشاور کے ... جو ... گئے ہیں ... نہیں ... عمل ... نہیں پایا جاتا ... بیچارگی مادی ... رہتی ہے۔ یہ بات بالکل ... سکتے ہیں ... اور اتحاد ... بھی ... نہیں رکھتے۔ یہ سب ... خواہش کے ... ہیں جس سے سید صاحب کی توہین ہوتی ہے۔ یہ لوگ سید صاحب کی روحانیت کو نہیں سمجھے ... نہیں کی، ان کا تعلق ... جن کی ... نہیں اور جن کی ... نہیں ہو سکتی، اور وہ عمل سے بے نیاز رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا حال قال سے مختلف ہے۔ وہ عملی ... مذہبی ... نہ وصال صنم" ان میں ذوالجلال کی ... نہیں، تعلق کے گیت گاتے ہیں، مگر ... سے تعلق کوئی نہیں کرتے۔ انہوں نے وحید کو ... شرعی احکام کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالتے ہیں ... سید صاحب کو ... شگفتہ

ہوجانا چاہیئے تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ طبیعت میں تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ تفویض و توکل کا رنگ نمایاں ہوا۔ تدبیروں سے دلچسپی نہیں رہی۔ بھلا بندۂ تسلیم کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ ان کو رضا و تسلیم میں ہشاش بشاش نظر آنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کے تغیر کے ہوش و حواس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی جان عزیز جان آفریں کی خدمت میں پیش کی ہوگی۔ ان کے کارفرماؤں نے محض ہوائی قلعے بنا کر دکھائے ہیں۔ ان کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد ہم آشنا کرد

---

(۹)

تعلیم

بیاورید گر اینجا بود سخن فہمے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

زمان و مکان۔ زمین و آسمان۔ فضا و خلاء۔ شجر و حجر، جن و انس۔ غرض ہر مخلوق اپنے خالق کی خود شہادت ہے۔ یہ ذات واجب الوجود واحد ہے اور لاشریک۔ اسم ذات اس کا "اللہ" ہے اور اسمائے صفت ہزاروں ہیں۔ یہ صفات کسی کی دی ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ خود دی ہیں اور ذاتی ہیں۔ اس ذات مقدس کے بغیر نہ نظام سنبھل سکتا ہے اور نہ بات بن سکتی ہے۔ اس کا جان لینا اور ہے اور مان لینا اور ہے۔ اصل پہچان دل سے ہوتی ہے۔ دماغ سے نہیں ہوا کرتی۔ باری تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ "قدرت کا ظہور اسی لئے کیا ہے کہ پہچانا جاؤں"۔ اس کی معرفت کا ذریعہ اس کی کتابیں ہیں۔ اور اس کے رسول ہیں۔ ان سے علم الٰہی حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ بھی۔ ورنہ قیاسی ظنی وجدانی طریقوں سے نہ کوئی کلیہ بنتا ہے اور نہ بن سکتا ہے اور اگر بنایا جائیگا تو آخر آخر غلط ثابت ہوگا۔ بغیر رسول کے کتاب ایک معمہ ہے۔ رسول اسی لئے بھیجا جاتا ہے۔ کہ اجمال و غوامض کی تفصیل بتائے۔ انسانی فطرت جتنی ترقی کرتی گئی اتنے ہی کتاب و رسول کے مدارج بلند ہوتے گئے۔ ہر مرتبہ نئی کتاب اور نئے رسول کی اسلئے ضرورت پیش آئی کہ لوگوں نے تحریف کرکے تعلیم الٰہی کو مسخ کر دیا۔ مگر جب انسانی فطرت کمال کو پہنچ گئی تو اکمل کتاب اور اکمل رسول مبعوث کئے گئے۔ اس کتاب و نبی کا سکہ ہر زمان و مکان میں قیامت تک چلے گا۔ گویا اس طرح دین مکمل ہو گیا۔ اس آخری کتاب قرآن مجید

نے پہلے والی تمام سماوی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ بلاغت، ربط و حکمت سے معمور ہے اسکی حفاظت خود رب العالمین نے اپنے ذمہ رکھی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

" اور بے شک۔ ہم نے قرآن یاد کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، ہے کوئی یاد کرنیوالا!" (سورہ قمر) کو یا حفظ کرا دینا حفاظت کی ایک ظاہری صورت ہے۔ وریہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور کتاب آج تک حفظ نہیں کی گئی۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی زیر و زبر کا فرق نہیں آیا۔ اس آیت قرآنی کا یہ مطلب بھی ہے کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور اس کے مطلب کو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ حدیث ہے کہ:

" جس نے اپنی رائے سے قرآن مجید کے متعلق کچھ کہا وہ جہنم میں اپنی جگہ بنا لے یعنی اپنا ٹھکانا بنائے۔ ایک اور حدیث ہے کہ،

" اللہ تعالیٰ اس امت کی اصلاح کے لئے ہر صدی کے آغاز میں ایک ایسا شخص بھیجتا ہے جو دینِ حق کی تجدید کرے"۔ تعلیمِ دین کی خاص ذمہ داری و تبلیغ کا کام خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خلفائے راشدین تابعین اور آل کے سپرد کیا ہے۔ آل میں نسبی و معنوی اولاد دونوں شامل ہیں۔ لیکن پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی تعلیم میں تحریف کرنے والے پیدا ہو گئے۔ ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ ۔۔۔ میری اُمت میں سے بہتر فرقے پیدا ہونگے۔ ایک ناجی فرقہ ہوگا جو میری راہ پر چلے گا اور عقیدہ و عمل میں بظاہر کتاب و سنت پر کاربند ہوگا۔ باقی فرقے غیر ناجی ہونگے جو سلفِ صالحین کے عقیدہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ تلاش کر لیں گے۔ مختصر یہ کہ قرآن کی جامعیت، فصاحت و بلاغت، اسرار و حقائق بے مثل ہیں۔ بلکہ یہ کہہ دینا صحیح ہے کہ وجود نبوی خود قرآن پاک کا مظہر ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ وہی خاتم النبیین سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین اور نبی الاُمّی بھی ہیں۔ بعثت سے پہلے قوم نے انہیں " امین" کا لقب دیا تھا ان کا اسوۂ حسنہ سارے جہان کیلئے نمونہ

ہے ان کے خلقِ عظیم کو زمین و زمان میں [illegible] ہے ان کو [illegible] میں [illegible] عطا کیا گیا ہے۔ وہ اپنی رحلت کے بعد [illegible] میں زندہ ہیں [illegible] کی بات ثبوت کو اہل ہے۔ [illegible] عبودیت ان کا وصف ہے رسالت و نبوت ان کو [illegible] ہے [illegible] رکھتا ہے۔ حضرت [illegible] مخلوق میں شامل ہیں ان کو بے مثل [illegible] سے بجا طور پر کہا گیا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرآن [illegible] مختصر شرک کی [illegible] یہ ہے۔ اور اہلِ کتاب کفار [illegible] ہیں۔

اشراک فی العلم، اشراک فی التصرف، اشراک فی العبادت، اور اشراک فی العادات وغیرہ۔

جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے [illegible] ہیں ان سب باطل [illegible] طور پر عقیدت سمجھائی گئی ہے۔ اور وہ خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود کہنا۔

۲۔ عرش و کرسی، آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے۔ اس کا خالق اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنا۔ ہر شے کا وجود اسی کی حکمت کاملہ کی وجہ سے ہے۔

۳۔ زمان و مکان میں اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے۔

۴۔ سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہی عبادت کے لائق ہے؛ اللہ کے واجب الوجود اور خالق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ تصرف

و عبادت کے متعلق اختلاف ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم بھی ہیں۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے زیادہ جلیل و عظیم ہستی کے سامنے اپنے عجز و تذلل کا اظہار کیا جائے مثال کے طور پر ایک محتاج و غریب بادشاہ کو سجدہ کرتا ہے۔ ان دونوں سجدوں کی صورت ایک ہے۔ مگر دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں۔ بادشاہ کے سامنے جھکنا سجدۂ تحیت و تعظیم ہے۱ اور رب العالمین کے سامنے سر نیاز جھکانا سجدۂ عبودیت ہے دونوں سجدوں میں نیت کا فرق ہے۔ اور دونوں کے مسجود بھی مختلف ہیں۔ بادشاہ کی عظمت فانی ہے۔ رب العالمین کی شان رفیع حدوث و امکان کے عیوب سے منزہ و بالاتر ہے۔ بادشاہ والی عظمت کو ساجد حاصل کر سکتا ہے اور رب العالمین کی رفعت و عظمت کو ساجد کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا مسجود کے خاص صفات قدرت عظمت و جلال تسخیر و تصرف اور نفاذ کلمہ ہیں۔ اوصاف تکوین و تخلیق سے بجز اللہ کے کوئی بھی متصف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی انسان میں اتنی استعداد ہے۔ مگر ذات باری تعالیٰ کے اوصاف میں سے بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جن کا بندہ میں ہونا ممکن ہے۔ چونکہ مشترکہ اوصاف کے لئے عام طور پر یکساں الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور قرآن پاک میں بھی ان کے متعلق کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے اکثر کلام مقدس کے نصوص و تصریحات کو غلط معانی پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ بس اسی کا نام شرک ہے۔ ایجاد و تخلیق اور اس نوع کے دیگر تصرفات ذات بے ہمتا کے لئے مخصوص ہیں۔ ان صفات عالیہ سے بندہ و مخلوق کی مجال نہیں کہ اپنے آپ کو متصف کریں۔ یا ان صفات سے کوئی کسی کو موصوف سمجھے مشرک وہ ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی کو فراموش کر کے شرکا کی پرستش کرتے ہیں لیکن کبھی بھی کامل اشخاص اولیائے کرام سے

۱۔ سجدۂ تعظیمی حرام قطعی ہے اس مسئلہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کا رسالہ "حرمت سجدۂ تعظیم" قابل دید و شنید ہے (ناشر)

ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں جن کا صادر ہونا ممکن سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ اور بے بصیرت لوگ ان افراد کامل و ملائکہ کی تسخیر و نفوذ کلمہ و عینیہ کو خدائے بزرگ و برتر کی تسخیر و نفاذ امر کی مانند سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بعض ذوات قوت مادیہ یا روحانیہ میں کسی طرح یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنا مظہر یا آلۂ تصرف بنا لیتا ہے۔ اس کی مثال فقط آلات و جوارح کی ہوتی ہے۔ یہ اوصاف کسی دوسری ہستی میں اسی وقت ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ وہ ہستی الوہیت کا مظہر ہو اور الوہیت کے خصائص اس میں پائے جائیں۔ اس صورت میں یہ اوصاف ان کے ذاتی نہیں ہوتے۔ بلکہ اللہ کے عطا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور عطائی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات ابلیس و آدم دونوں کو عطا کئے تھے۔ ان ہی صفات کے بل پر دونوں سے استعلیٰ یا نافرمانی سرزد ہوئی۔ سجدہ نہ کرنے کے متعلق ابلیس نے توجیہہ کی لہٰذا حجت کرنے کی وجہ سے مردود ٹھیرا۔ درخت ممنوعہ کھا لینے پر آدم علیہ السلام نے عجز و ندامت سے معافی کی درخواست کی لہٰذا نہ صرف معاف کئے گئے۔ بلکہ مقبول و برگزیدہ بنائے گئے۔ انبیاء و اولیاء افضال الٰہی کا احساس رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھا کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو محتاج سمجھنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو صاحب ارشاد ہونے سے پہلے روحانی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جس سے وہ اصل حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اب شرک اس وقت ہوگا جب کسی کو کسی کمال میں مستقل بالذات تصور کیا جائے۔ جس امتیاز و فرق کو سمجھنے کی وجہ سے نہ شرک کے معنی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اور نہ توحید تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جن کو امتیاز کا احساس نہیں۔ اُن کا دعویٰ صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ اور پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اپنے جیسے کا اتباع بھی نہیں کیا جاتا۔ اللہ کو بے شک اختیار ہے کہ اپنے کسی بندے کو جس حد تک بھی چاہے اپنی صفات کا مظہر اور دلیل بنا دے۔ مگر بندے کے یہ اوصاف

عطیۂ الٰہی ہوا کرتے ہیں۔[۱]

کلمۂ طیّب۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اسلام میں ایمان کی بنیاد ہے۔ اقرار توحید و رسالت ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اس کے دو جز ہیں اور پہلے جز کے دو حصے ہیں۔ لا نفی کا ہے۔ گویا شرک سے انکار کر دیا پھر اِلَّا اللّٰہ سے اثبات کیا۔ اور توحید مکمل ہو گئی جس طرح بلندی و روشنی سے پستی و تاریکی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح توحید سے شرک دور ہو جاتا ہے۔ شرک یقیناً ہیچ ہے اور دور ہونے ہی کی شے ہے۔ کلمہ طیب کا دوسرا جز محمد الرسول اللہ ہے۔ جس میں صفت و موصوف دونوں ہیں۔ یہ ایسے معظم رسول ہیں جنہیں علم و حکمت سے نوازا گیا ہے۔ وہ عقائد باطلہ کو دور کر کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم سکھاتے ہیں۔ اور لوگوں کو پاک و مزکی بنا دیتے ہیں۔ یہ دوسرا جز پہلے جز کا صحیح ترجمہ و نقل ہے۔ یعنی جس نے محمد الرسول اللہ کو نہیں سمجھا۔ اس نے اِلَّا اللّٰہ کو نہیں سمجھا اور محض لا میں مبتلا ہو کر رہ گیا جس طرح تشبیہہ کفر ہے۔ اسی طرح تنزیہہ بھی کفر ہے۔ حقیقت واقعی دونوں کے وسط میں ہے۔ اس دوسرے جز کی ذرا بھی تنقیص کی تو ایمان غائب اور عاقبت خراب۔ رسول کریم کی ہدایت ہے کہ قرآن سیکھو۔ اور دوسروں کو سکھاؤ کسی نے لطف و احترام کے ساتھ نصیحت کی ہے۔

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

یہ تمہید اس لئے اٹھائی گئی ہے کہ سید احمد صاحب کی تعلیمات کو سمجھا جائے اور کوئی غیر مفید نتیجہ نکالا جائے۔ اصل یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی یا تیرھویں صدی ہجری میں سلطنت مغلیہ کے زوال کی وجہ سے ہندوستان میں مرکز متزلزل ہو گیا تھا۔ زمین و آسمان کی گردشیں بدل گئی تھیں۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ تباہی سے نہیں بچ سکا تھا۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی۔ اخلاقی اور مذہبی خرابیاں اپنی صحت و درستی

---

(۱) ملخص از تحفۃ الانفس

کے لئے کسی مصلح کی متقاضی تھیں۔ چنانچہ اس وقت اصلاح کا بیڑا سید احمد نے اُٹھایا۔ اور وہی اس زمانہ کے مجدد اور امام خیال کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے صرف شعبہ مذہب پر توجہ فرمائی اس لئے کہ مذہب جملہ شعبہ جات پر حاوی ہے لیکن دیگر شعبہ جات پر توجہ کرنے کی انہیں مہلت و فرصت نہ مل سکی۔ انہوں نے کچھ معاشرتی بدعات کی مخالفت فرمائی ہے یعنی ترک نکاح بیوگان، تعیین حد مہر، شادی و غمی کی رسومات میں اسراف کی ممانعت۔ مگر یہ شاہ ولی اللہ کی تلخیص ہے جس کی تردید کے ساتھ شاہ عبدالعزیز نے اشاعت کی تھی۔ اور یہ سید صاحب کی ایجاد نہیں ہے۔ ان کی مذہبی تعلیمات سے معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف تین ذرائع ہیں۔ تقویۃ الایمان، صراط مستقیم اور ان کا ایجاد کردہ طریقۂ محمدیہ۔ ان کا اتباع کرنے والے تقویۃ الایمان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی کی تقلید کرتے ہیں۔ صراط مستقیم کا ذکر بھی کبھی آجاتا ہے۔ مگر طریقۂ محمدیہ در گذشت۔

تقویۃ الایمان شاہ اسمٰعیل نے جامع مسجد دہلی کے مباحثوں کے دوران میں سکھوں کے مظالم کی تحقیق کی غرض سے پنجاب کا خفیہ دورہ کرنے سے پہلے لکھی تھی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ یہ کتاب سفر حج سے کچھ قبل لکھی تھی۔ تقویۃ الایمان کی تکمیل کے بعد انہوں نے خود اپنے احباب کے سامنے اقرار کیا تھا کہ اس میں اکثر جگہ شرک خفی کو شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ بہرحال تقویۃ الایمان کی تصنیف اس وقت ہوئی تھی جبکہ سید احمد صاحب بمقام مالوہ نواب امیر خان کی فوج میں تھے۔ نہ اس وقت تک سید صاحب کو خلافت ملی تھی، اور نہ شاہ اسمٰعیل ان کے مرید ہوئے تھے لہذا سید صاحب کو تقویۃ الایمان سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور یہ کتاب خالص شاہ اسمٰعیل کے معتقدات کا آئینہ ہے۔

صراط مستقیم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ دوآبہ کے دورے کے بعد اپنے وطن کے قیام میں شاہ اسمٰعیل سے سید صاحب نے لکھوائی تھی۔ ممکن ہے کہ صراط مستقیم، تقویۃ الایمان

سے علیحدہ ہو یا سید صاحب کی اصلاح کے بعد تقویۃ الایمان کی نظر ثانی شدہ کتاب ہو۔ اگر صراطِ مستقیم اصل کتاب ہے تو اس سے تقویۃ الایمان منسوخ ہو گئی۔ اور اگر نظر ثانی شدہ تقویۃ الایمان ہے تو مشترک مضامین کے علاوہ جو اصلاح شدہ مضامین اس میں ہیں وہ سید صاحب کے بتائے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اگر صراطِ مستقیم سے سید صاحب کا کوئی تعلق ہے تو حیرت ہے کہ اصلاح شدہ مضامین کو باوجود مرید ہونے کے شاہ اسمٰعیل نے کیوں نہیں تسلیم کیا۔ اور مشترک مضامین کو سید صاحب نے کیوں نہیں گوارا کیا۔ اور کیوں وہ اپنے موروثی مذہب پر قائم رہے۔ سید صاحب کا ایک خط سوانح احمدی کے ضمیمہ میں موجود محفوظ ہے جو انہوں نے علمائے سرحد کے اعتراضوں کے جواب میں شاہ اسمٰعیل سے لکھوایا ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ:۔

"یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں ہے۔ اس فقیر کو اور اسکے بزرگوں کو سب جانتے ہیں کہ اُس کا آبائی مذہب حنفی ہے۔ اور اس زمانہ میں بھی اس فقیر کے تمام اقوال و افعال حنفیہ اصول و قوانین اور ان کے ہی آئین و قواعد پر منطبق ہیں۔ ایک بھی اصولِ مذکورہ سے خارج نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جو ان اصحاب سے غفلت اور بھول چوک میں صادر ہو جاتا ہے وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں اور مطلع ہو جانے پر راہِ راست پر آجاتے ہیں"

اس تحریر پر دو امور ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے متعلق حنفی ہونے کا یقین دلایا ہے دوسرے یہ کہ الا ماشاء اللہ لکھ کر اپنے اصحاب کی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت کی ہے۔ یہ معذرت اس غلط وعظ کے متعلق ہے۔ جو انکارِ تقلید کے جواز میں شاہ اسمٰعیل نے پنجتار کے جلسہ علماء میں دیا تھا جس کو سُن کر علمائے سرحد برگشتہ ہو گئے تھے۔ اور خادی خان بھی اپنے مُرشد کے اتباع میں سید صاحب سے منحرف ہو گیا تھا اور

لہ حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات کے۔

خود سید صاحب نے اسی وقت سب کے سامنے شاہ اسمٰعیل کو ڈانٹ بتائی تھی کہ تمہیں ایسی لغویات نہیں کہنا چاہئے تھیں. معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل ہر مرتبہ اپنے عقائد کے اظہار پر معافی طلب کیا کرتے تھے. مگر اپنی توبہ پر قائم نہیں رہتے تھے۔

" امداد المشتاق " کے صفحہ ۹۰ کے مقالہ نمبر ۱۳۲ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی روایت درج ہے کہ ـــ " مولوی اسمٰعیل شہید موحد تھے. چونکہ محقق تھے. چند مسائل میں اختلاف کیا. اور مسلک پیران خود مثل شاہ ولی اللہ وغیرہ سے نکال فرمایا. وحدت الوجود کے قائل تھے اور ان کے مرشد حضرت سید صاحب مسلک وحدت الشہود کا رکھتے تھے. باہم گفتگو ہوتی سید صاحب کچھ کبیدہ ہوتے. عرض کیا. یہ بات اور ہے. کہ دن کو رات کہئے یہ حکایت مقام منی میں واقع ہوئی تھی. ایک شخص نے اس کو مجھ سے بیان کیا. جو اس مجلس میں حاضر تھے "

مولوی کرامت علی جونپوری' سید صاحب کے اعاظم خلفا میں سے تھے انہوں نے اپنی کتاب " نور علی نور " میں لکھا ہے کہ ـــ " مرشد برحق آپ مقلد تھے اور تقلید کے خلاف جو کوئی شخص کرتا تو اپنی محفل سے نکلوا دیتے تھے. اور جو تعلیم پذیر ہوتا تو مرشد برحق اس کو نصیحت کرکے راہ راست پر لاتے اور یہ بات تمام ہندوستان اور بنگالہ میں مشہور ہے.... فرد میں آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل نہیں تھے اور نہ اس کو اچھا سمجھتے تھے "

اس بیان سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل کا شمار تعلیم پذیر ہونے والوں میں تھا. مگر نصیحت کو اور راہ راست پر آنے کو انہوں نے قبول نہیں کیا بہر حال ان وجوہات کی وجہ سے سید صاحب کا تعلق صراط مستقیم سے قطعی طور پر منقطع ہو جاتا ہے. اور ان کے متعلق ایسی بدگمانی وہم میں بھی نہیں کی جا سکتی ۔

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس برابر است   باما شراب خورد بہ زاہد نماز کرد

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سید صاحب کا کوئی تعلق ان دونوں کتابوں سے نہیں ہے تو یہ تعلیم جو سید صاحب سے منسوب ہے۔ وہ تعلیم دراصل شاہ اسمٰعیل کی ہے یعنی شاہ اسمٰعیل کی تعلیم کچھ اور ہے اور سید صاحب کی تعلیم کچھ اور ہے۔ دونوں کو مخلوط کر دینا فتنہ سے کم نہیں۔ اور اس مخلوط تعلیم کے متعلق شاہ عبدالعزیزؒ کی جو تصدیق و شہادت پیش کی جاتی ہے۔ وہ سراسر غلط اور بہتان ہے۔ چونکہ سید صاحب شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کی تقلید کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں عروج ہوا اور اسی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان دونوں کتابوں میں جو مضامین مخالف ہیں ان کی دو ایک مثالیں امتثال امر کے لئے پیش کی جاتی ہیں :-

تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنٹائل پریس دہلی میں ہے کہ :-

(۱) سوائے اللہ کے چاہے ہوئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول کو بھی کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی ایسے ایسے ہیں (نقل کفر کفر نباشد) مگر صراط مستقیم مطبوعہ ضیائی پریس دہلی میں تحریر ہے کہ رسول کی ہستی تو بہت بڑی ہے ولیاء، قطب اور ابدال تک باذن الٰہی سب کچھ اختیار رکھتے ہیں :-

حکیم مومن خان مومن جس طرح شاہ اسمٰعیل کے معتقد تھے اسی طرح مرزا غالب مولینا فضل حق خیر آبادیؒ سے مستفیض تھے۔ غالب نے اپنے شعر میں یہی مضمون لکھا ہے ؎

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق ست
لیکن کشاد آں بہ کمانِ محمدؐ است

(۲) تقویۃ الایمان کے مطابق " نذر و نیاز و فاتحہ شرک ہے اور اس کا کرنے والا ابوجہل کی برابر مشرک ہے " لیکن صراط مستقیم کے صفحہ ۲۷ پر درج ہے کہ :-

" نپنداری کہ نفع رسانیدن باموات باطعام و فاتحہ خوانی خوب نیست چہ ایں معنی بہتر و افضل " اور صفحہ ۹۳ پر تحریر ہے کہ :-

"پس در خوبی این قدر امر از امور مرسومہ فقہا و علما کی نذر و نیاز اموات شک و شبہ نیست" اور صفحہ ۲۲ پر خواجگان چشت کی نذر و نیاز کرنے کا باقاعدہ طریقہ بتایا ہے جو حصول کار کے لئے مجرب ہے۔

(۳) تقویت الایمان میں فقرہ نمبر پہ یہ مضمون درج کیا ہے "خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے، خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے۔ ہر طرح شرک ہے۔ برخلاف اس کے صراط مستقیم کے صفحہ ۲۸ پر علم و طاقت حاصل کرنے کے لئے شغل دورہ کی ترکیب بتائی ہے"

ان تصرفات کے علاوہ ایسی کئی متعدد مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل کو قرآن و حدیث کے معنی بدل دینے اور تحریف کرنے میں تکلف نہیں ہوتا تھا۔ نمونہ کے طور پر ایک ایک مثال کافی ہے۔

(۱) شاہ اسمٰعیل نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ دیا ہے۔ سب سے پہلے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کے معنی پر کہ حیرت و غصہ کا اظہار کیا ہے کہ جب یہ اقرار و عہد ہر روز ہر نماز کی ہر رکعت میں کیا جاتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ پھر غیراللہ یعنی انبیاء، اولیاء اور شہید فرشتوں اور پریوں سے کیوں مدد مانگی جاتی ہے۔ اس کا جواب علماء نے جو دیا ہے وہ اپنی جگہ ہے۔ مگر شاہ صاحب کے ہمعصر مرزا غالب جب یہ اتہام سنتے سنتے اکتا گئے تو انہوں نے ایک شعر لکھ کر دیا۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اس کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ. صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ "تو ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر تیری برکت نازل ہوتی ہے اور اس راستہ سے بچا جس پر تیرا غصہ ہے" اَلَّذِينَ کا لفظ اس ترجمہ

میں ہارج و مانع ہے۔ وہ اپنے ترجمہ میں بجائے راستہ کے۔ راستہ چلنے والوں کے الفاظ لکھتے تو ان کا ترجمہ صحیح ہو جاتا۔ انہوں نے بجائے راستہ چلنے والوں کے راستہ کا لفظ اسلئے لکھا ہے کہ کسی کو انکار تقلید کی تردید کا موقع نہ مل سکے۔ لہٰذا اس تحریف کو بر بنائے مصلحت جائز خیال کیا۔ شاہ اسمٰعیل کو غالباً صراطِ مستقیم کے متعلق بھی مغالطہ ہے۔ وہ اسے ٹھنڈی سڑک سمجھتے ہیں۔ جس پر تفریح کے لئے چہل قدمی کی جاتی ہے اور نہیں سمجھتے کہ اس راہِ راست میں بے حد اُتار چڑھاؤ ہیں۔ اور اس پر چلنے والوں کی بے طرح آزمائش کی جاتی ہے۔ اتنی کہ دشمنوں کی بھی نہیں کی جاتی۔ بیشک وہ جنت سے ناک کی سیدھ پر آنکھوں کے سامنے ہے مگر یہ سیدھا راستہ نہایت نازک اور بے حد شفاف اور چکنا ہے۔ اس پر چلنے سے سانس پھول جاتی ہے۔ دم اُکھڑ جاتا ہے۔ پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں اور ہمت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ جب ہی تو نفس پرست اور خود نمائی کا اس پر گذر نہیں ہوتا۔

۲۔ حدیث کا ترجمہ کیا ہے۔ "بھلا خیال تو کر جو گذرے میری قبر پر کیا سجدہ کرے تو اُس پر" پھر اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ "میں بھی ایک دن مٹی میں ملنے والا ہوں"[1] ناطقہ سربہ گریبان ہے اسے کیا کہیئے

رہا طریقۂ محمدیہ۔ "صراطِ مستقیم" میں اس کی ایجاد کا مقصد سید صاحب نے خود یہ بتایا ہے کہ جملہ سلسلوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ چاروں طریقوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت بطورِ باطن کے ہے۔ اور نسبت ہمارے طریقۂ محمدیہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ ظاہر کے ہے۔ یعنی اس طرح شریعت کو طریقت پر ترجیح دی ہے۔ اور آخر کار طریقت سے فرار کی صورت نکالی ہے۔ اور بقول ان کے اپنے خاص خلیفہ عبدالرحیم فاطمی سے شہادت دلوائی ہے کہ:۔

"مجھے باطنی مشاغل سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب سید صاحب کے طریقہ کے ظاہری

---

[1] الکوکبۃ الشہابیہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ نے ایسے اختلافی اور تحریفوں کی ستر مثالیں درج کی ہیں۔

اعمال سے مثلاً گھاس کاٹنے اور دیوار بنانے سے سب کچھ مل گیا۔ اس سے قبل اگر مرجاتا تو عاقبت خراب ہو جاتی۔"

ہر شخص جانتا ہے کہ شریعت سیکھ لینے کے بعد طریقت کی منزل آتی ہے۔ مگر طریقۂ محمدیہ میں معاملہ دگرگوں ہے۔ یعنی حُبِ ایمانی اور حُبِ یوسفی کی ترتیب بدل کر موخر کو مقدم کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے۔ جس سے ترتیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال ہیں۔"

شریعت و طریقت میں بظاہر دوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ دونوں میں اتحاد ہے ایک ہی زنجیر کی دونوں کڑیاں ہیں۔ اب چاروں سلسلوں کی نسبتِ باطنی میں نسبِ ظاہری کو داخل کر کے عقل حیران ہے۔ کہ اتحاد پیدا کیا یا تفرقہ کی بنا ڈالی۔ یہ چاروں سلسلے خود ہی پہلے سے آپس میں متحد ہیں۔ پھر نئی ایجاد کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔

طریقۂ محمدیہ کا جو اصول سید صاحب کی زبان سے کہلوایا ہے وہ سید صاحب کے مسلک کے قطعی خلاف ہے۔ لہذا یہ بھی شاہ اسمٰعیل کی ایجاد کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔ سید صاحب سے اس کا بھی کوئی تعلق نہیں، اور شاہ عبد الرحیم فاطمی کو سید صاحب کا خلیفہ ظاہر کر کے یہ بتایا ہے کہ شاہ عبد الرحیم فاطمی کو شاہ عبد الباری امروہوی سے نہ فیض حاصل ہوا تھا۔ اور نہ خلافت ملی تھی۔ اس دعوی کو سن کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی شاخ صابری نہیں رہتی۔ بلکہ نقش بندی بن جاتی ہے۔ اس کا فیصلہ حاجی صاحبؒ کے مرید اور شاہ اسماعیل کی جماعت خود ہی کرے تو بہتر ہو۔ ویسے حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

شاہ اسماعیل کی تعلیم جدت سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے معیار و نظریہ کو بڑے غور و خوض سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تقویت الایمان کے شرک و توحید والے باب میں صفحہ پانچ پر لکھتے ہیں۔

"اول سننا چاہیئے کہ شرک لوگوں میں پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب ہے لیکن اکثر لوگ توحید کے معنی نہیں سمجھتے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں" یہاں لوگوں سے ان کی مراد مسلمانوں سے ہے۔ وہ شرک میں گرفتار ہو گئے ہیں ان کو شرک سے نجات دلانے کے لئے توحید کے بجائے شرک کی تفصیلات سے واقف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک توحید مرکز ہے۔ اور اس کا دائرہ شرک ہے جس نے مرکز کو محدود و مقید کر رکھا ہے۔ وہ وسط کے قائل نہیں ہیں اور صرف ایک حد پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں کُل دائرہ شرک سے بھرا ہوا ہے۔ توحید لفظ کُن سے اپنا کام بنا لیتی ہے۔ اسے محرم و غمگسار کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے شرک کے پاس ہر قسم کے اسباب ہیں۔ اس کی فوج عظیم و کثیر ہے۔ اسی واسطے وہ توحید کے معاون و مددگار بن کر شرک کی مخالفت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ توحید کو ان کی مدد درکار نہیں ہے۔ اسی لئے ظہورِ اسلام سے پہلے اہلِ کتاب اور بُت پرست وغیرہ کے جتنے بھی شرک تھے وہ سب ہم عاصی مسلمانوں پر منطبق کر دیئے اور شرک کے متعلق جتنی بھی آیاتِ قرآنی تھیں وہ ہم پر عائد کر دیں۔ اب جبکہ مسلمانوں کو قطعی مُشرک بنا دیا۔ تو ان کا قتل کر دینا بھی جائز ہو گیا۔ اس طرح توحید کی طرف آنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ حالانکہ توحید خود وسیع النظر ہے اور وسعت چاہتی ہے۔ اندریں حالات وہ اپنے آپ کو اور اپنی مٹھی بھر جماعت کو ہی توحید پرست سمجھتے ہیں اور خدا کا منشائے تبلیغ پورا کر دیتے ہیں۔ عام اور حقیقی مشرکین کو وہ قابلِ توجہ نہیں سمجھتے، صرف شرک میں گرفتار شدہ مسلمانوں اور کلمہ گویوں پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اصول و اختراع کی فہرست کچھ ایسی بنتی ہے :-

(۱) تقلید شرکِ عظیم ہے۔ باپ دادا اور علماء و ائمہ کی کبھی نہ سنو۔

(۲) قرآن سمجھنے کے لئے زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس کو اپنے مبلغ علم کے مطابق

سمجھا جا سکتا ہے۔

(۳) وسیلہ، شفاعت اور جمارع بے معنی الفاظ ہیں۔

(۴) انبیا و اولیا کو قدرت نہیں، لہٰذا ان سے مدد مانگنا فضول ہے۔

(۵) اولیاء کا فیض اور ان کی کرامت ناقابلِ توجہ ہے۔

(۶) اولیاء وغیرہ کو ندا کرنا شرک ہے، محفل میلاد بدعت ہے۔

(۷) نذر و فاتحہ کی ضرورت نہیں۔

(۸) نماز میں رسول کا خیال آ جانا حرام ہے۔

(۹) کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا کفر ہے۔

(۱۰) چونکہ اختیار نہیں رکھتے اس لئے انبیا و اولیا وغیرہ سب بھو ت پریت کی برابر اور ناکارہ ہیں۔

(۱۱) آمین بالجہر اور رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

(۱۲) قبروں پر روشنی کرنا شرک ہے۔

(۱۳) تصوف بدعت ہے۔

(۱۴) تصورِ شیخ مشرکوں کا طریقہ ہے

(۱۵) کثرتِ ذکر جائز نہیں ہے۔

(۱۶) رسول کو غیب کا علم نہیں ہے۔

(۱۷) خاتم النبیین کا نظیر ممکن ہے۔

(۱۸) رحلت کے بعد رسول مثل عام مُردوں کے ہیں، اور ان کی حیات ختم ہوگئی، قیامت میں اُٹھیں گے

(۱۹) بزرگوں کے مزارات پر جانے کے لئے سواری کا انتظام کرنا شرک ہے

(۲۰) وغیرہ وغیرہ۔

اسمٰعیلی جماعت اس اختراع واصلاح کو شاہ اسمٰعیل کا شاہکار سمجھتی ہے لیکن یہ اُن کی ذاتی جدت نہیں ہے۔ بلکہ ابنِ تیمیہ اور ابن عبدالوہاب کی عطا کردہ ہے اور اُنہی کی وہ تقلید کرتے ہیں۔

یہ تینوں صاحب تند مزاج، سخت زبان اور انتہا پسند تھے۔ ان تینوں نے زبان، قلم اور تیغ سے اپنی تعلیم کی تبلیغ کی ہے، اور مسلمانوں سے جنگ کرنے کو جہاد سے تعبیر کیا ہے چونکہ ان تینوں کا ماحول اور زمانہ جُدا جُدا تھا۔ اسلئے ان کے نتائج بھی مختلف ہیں سب سے پہلے جب ابنِ تیمیہ نے اپنی جدتوں کا اعلان کیا تو مصر کی اسلامی حکومت نے نہ صرف بازپرس کی، بلکہ متعدد مرتبہ قید و بند کی سزائیں بھی دیں۔ لہذا ان کی تعلیم بارآور نہ ہو سکی۔ مگر ان کی شکست خوردہ ذہنیت کے جوہر اس وقت کھلے جبکہ نو مسلم چنگیزی مغل سلطان غازان خان نے مصر پر حملہ کیا۔ اس حملہ سے پہلے وہ غازان خان کے دربار میں حاضری دے آئے تھے۔ اُس نے ان کا استقبال احترام کے ساتھ کیا تھا اور ان سے دعائے برکت حاصل کی تھی۔ پھر اس نے قدر دانی و عقیدتمندی کی بناء پر ان کے کہنے سے جنگ حمص میں جو مسلمان عیسائی اور یہودی گرفتار کئے تھے۔ ان سب کو رہائی بھی عطا کر دی تھی۔ مگر اب حملۂ مصر کے وقت ابنِ تیمیہ نے غازان خان کے خلاف نہ صرف فتوے دیئے بلکہ کمزور مصریوں کی ہمت بھی بڑھائی اور خود جہاد میں شریک ہوئے۔ اس جہاد کی کامیابی نے انکی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ مدعا یہ کہ ان کی تجدید سے زیادہ ان کا جہاد کامیاب رہا۔

اپنے زمانہ میں ابنِ تیمیہ کی تقلید میں ابن عبدالوہاب نے بھی دعوٰی کیا کہ میں نیا دین لایا ہوں۔ اور یہ دعوٰی اس وقت کیا تھا جبکہ امیرانِ عرب اقتدار کیلئے آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ابنِ عبدالوہاب نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر سب سے پہلے امیر عینیہ سے ساز کیا، لیکن جب وہ ان سے منحرف ہو گیا تو امیر درعیہ عثمان کی تائید و حمایت

حاصل کی مسلمانوں کو مشرک قرار دیکر جہاد کا اعلان کیا۔ اور مصر و عرب میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس طرح دونوں کو فائدہ ہوا ابن سعود کی ریاست میں اضافہ ہوا اور ابن عبدالوہاب کی تعلیم کو ترقی ہوئی اس جوڑ توڑ کی وجہ سے البتہ ابن عبدالوہاب کو ابن تیمیہ پر فوقیت حاصل ہے۔

اب یہاں ہندوستان میں ان دونوں کی تقلید میں شاہ اسمٰعیل نے نام اچھالا اور ایک نیک انسان سید احمد بریلوی کے پردے میں تبلیغ و جہاد کی کوشش کی مگر مشہور یہ ہے۔ نقل را چہ عقل لہذا کامیابی نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ جس وقت شاہ اسمٰعیل نے اعلان کیا ہے انگریز تسلط جمانے کے لئے مسلمانوں کو تباہ کر رہے تھے۔ پادری ہندوستان کے مذاہب کی تردید کرنے کے لئے کوچہ و بازار میں سرگرداں تھے۔ دیہاتی مکتبوں میں عیسوی تعلیم کی ترویج ہو رہی تھی اور سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا سید صاحب کی ولایت اور شاہ اسمٰعیل کی علمی فضیلت ان تمام مصائب سے بے نیاز رہی اور اپنی تعلیم کا ان صاحبان نے جھنڈا بلند کیا۔ اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں ان کے فرائض میں تھا کہ کالے پادریوں کی تکذیب کرتے اور اسلام کی فوقیت ثابت کرتے مگر انہوں نے اس طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا۔ صرف اسلئے کہ پادری انگریز حکام کے ہم منصب تھے اور انگریز حکام کی ناخوشی خاطر منظور نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ انگریز نے انکی تبلیغ کی حسب ضرورت مدد بھی کی۔ غالباً ان ہی کے اشارے سے یہاں کے مسلمانوں کو خاک بسر چھوڑ کر اور بعض اپنے معتقدین کو ساتھ لیکر تبلیغ و جہاد کے حیلے سے ہندوستان سے باہر گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس دار فانی سے سفر کیا تو اس کے چند سال بعد کچھ معمولی اسباب، اور کچھ ہوس ملک و مال انگریزوں کی زیادتیوں اور کالے پادریوں کی اشاعت مسیحیت کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں فتنہ و فساد ہوا جس کو انگریز "غدر" سے اور وطن پرست "تحریک آزادی" سے موسوم کرتے ہیں

خیر خاک بر سر کن غم ایام را۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں انگریزوں نے جماعت اسمٰعیلیہ کو شہ دی۔ پھر مطلب نکل جانے کے بعد آخر میں بُری طرح آنکھیں پھیر لیں۔

بہر حال ان موحدوں کا دعوٰی اتحاد راہِ درانہ اختیار کر کے مسلمانوں کے اختلاف و انتشار کا باعث بنا۔ انہوں نے اپنی حسن قابلیت سے جزیات پر طبع آزمائی کی اپنی دماغی کاوشوں سے فروعات کو پکایا، اور کلیات کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ شرک کا خوف ان کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گیا کہ خواب میں بھی شرک ہی شرک نظر آنے لگا۔ اسی وجہ سے ان کے نظریات میں بدرجۂ اتم تذبذب موجود ہے اور اس کی تصدیق و شہادت تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کے اختلافات اور مضامین سے ہو جاتی ہے۔ بالفرض انہیں اپنے معتقدات پر وثوق تھا۔ تو در پردہ شاہ عبدالعزیزؒ سے استفسار کیوں کیتے جاتے تھے۔ فتاوٰی عزیزیہ میں ان کا سوال ایک بُت پرست اور ایک عالم کے مکالمہ کی صورت میں محفوظ و موجود ہے اور وہ سوال یقیناً شاہ اسمٰعیل کی تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ ہے۔ اُن کی یہ پریشانی محض تقلید سے انحراف کرنے اور صفاتِ الٰہی، صفاتِ انبیاء و اولیا اور صفاتِ انسانی میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے ہے۔ ان کے جملہ اختراعات ان ہی مغالطوں پر مبنی ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کا اطمینان بخش جواب لاجواب ہے مگر ان کی سمجھ میں کب آنے والا تھا۔ اہل نظر اگر ذرا تفکر و تدبر سے کام لیں تو شاہ اسمٰعیل کی اصلاح و تعلیم میں سوائے تخریبی پہلو کے کوئی خاص تعمیری پہلو نہیں دکھائی دیگا۔

اب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا جواب ملاحظہ ہو،

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

قدس سرہٗ

سے "موحد" کا سوال

ان کا

جواب لاجواب

سوال۔ ایک بت پرست بت سے مدد مانگ رہا تھا۔ ایک عالم نے منع کیا کہ شرک مت کرو۔ بت پرست نے کہا کہ خدا کا شریک تجویز کریں تب شرک ہوگا، تو بت شریک ہوگا۔ عالم نے کہا: قرآن شریف میں متواتر آیات ہیں کہ "غیر خدا سے مدد نہ مانگو"۔ بت پرست نے کہا کہ انسان ایک دوسرے سے کیوں سوال کرتے ہیں۔ عالم نے کہا کہ انسان زندہ ہیں اور تیرے بت مثل کنہیا و کالکا وغیرہ کے مردہ ہیں کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔ بت پرست نے کہا کہ قبر والوں سے مدد اور شفاعت طلب کرتے ہو۔ چاہئے کہ تم اسے بھی شرک مانو۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اہل قبور سے جو تمہارا مقصود ہے ویسا ہی کالکا کی تصویروں سے ہمارا ہے۔ ظاہری طور پر نذر و نیاز دیتے ہیں اور بت اگر کہو کہ قبر والے قوت باطن سے انکشاف حالات کرتے ہیں تو بہت تجربوں سے بھی حاجت روائی ہوتی ہے اور اگر تم کہو کہ ہم اہل قبور سے کہتے ہیں کہ خدا سے ہمارے لئے

شفاعت کیجئے تو ہم بھی بتوں سے ایسی ہی استدعا کرتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر اہل قبور سے استمداد کا جواز ثابت ہوتا ہے تو بعض ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا اور مسانی کے پوجنے سے کیسے باز آجائیں گے؟

جواب۔ اس سوال میں چند جگہ اشتباہ واقع ہوا ہے۔ اس سے خبردار رہنا چاہیئے تاکہ اللہ کے فضل سے سوال کا جواب اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ مدد چاہنا اور چیز ہے اور پرستش دوسری چیز ہے۔ عام مسلمان اہل قبور سے مدد چاہتے ہیں۔ پرستش نہیں کرتے، بُت پرست مدد بھی چاہتے ہیں اور پرستش بھی کرتے ہیں۔ پرستش یہ ہے کہ سجدہ کرے یا طواف کرے۔ یا اس کے نام کو بطریق تقرب ورد کرے یا اس کے نام پر جانور ذبح کرے یا اپنے آپ کو اس کا پجاری کہے۔ اگر کوئی جاہل مسلمان اہل قبور کے ساتھ ایسا کرے تو وہ فوراً کافر ہو جائیگا۔ دوسرے مدد چاہنا دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک مخلوق دوسرے مخلوق سے مدد چاہنا۔ جیسے امراء و بادشاہ سے نوکر اور فقیر مدد چاہتے ہیں۔ اور عوام الناس اولیاء سے چاہتے ہیں کہ جناب الٰہی میں ہماری حاجت عرض کیجئے اس قسم کی مدد شرع میں زندہ و مُردہ دونوں سے جائز ہے۔ دوسرا طریقہ مدد چاہنے کا یہ ہے کہ جو چیزیں بالاستقلال جناب الٰہی کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے بیٹا دینا۔ مینہ برسانا۔ بیماری دور کرنا یا عمر دراز کرنا وغیرہ کسی مخلوق سے چاہے اور اللہ سے دعا و سوال کرنا نیت میں نہ ہو۔ (یعنی یہ سمجھے کہ یہ چیزیں یہ بزرگ خود دیں گے) اس طرح کی مدد مانگنا حرام مطلق بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی زندہ یا مُردے سے اس قسم کی مدد چاہے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ بہ خلاف بُت پرستوں کے کہ وہ اس قسم کی مدد اپنے معبودانِ باطل سے چاہتے ہیں۔ اور اس کو جائز سمجھتے ہیں اھ

یہ بات جو بُت پرست نے کہی کہ میں اپنے بتوں سے شفاعت چاہتا ہوں۔ یہ بڑے دھوکے اور فریب کی بات ہے۔ اسلئے کہ بُت پرست ہرگز شفاعت نہیں چاہتے۔ بلکہ

شفاعت کے معنی تک نہیں جانتے۔ ان کے دلوں میں شفاعت کا تصور تک نہیں ہوتا۔ شفاعت کے معنی سفارش ہیں۔ اور سفارش یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے مطلب کو کسی اور کی خدمت میں عرض کرے۔ بُت پرست اپنے مطالب کی درخواست کے وقت نہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ تم پروردگار کے حضور میں ہماری سفارش کر دو۔ اور ہماری مراد اس سے پوری کروا دو۔ بلکہ وہ خاص اپنے بتوں سے ہی درخواست مطلب کرتے ہیں اور بُت پرست کا یہ کہنا کہ اہلِ قبور سے جو تمہارا مقصد ہے وہی ہمارا کالکا۔ و کنہیا کی تصویروں سے ہے۔ یہ بات بھی غلط در غلط ہے۔ اسلئے کہ جو جسم قبروں میں دفن ہیں انکی ارواح کو ان کے ساتھ تعلق ضرور رہتا ہے۔ کیونکہ وہ روحیں مدت دراز تک اُن جسموں میں رہی ہیں۔ اور بُت پرست اپنے معبودوں کی قبروں کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے تصویریں۔ پتھر۔ درخت۔ اور دریا قرار دیتے ہیں۔ کہ فلاں کی یہ صورت ہے بغیر اس کے کہ ان چیزوں کو ان کی روحوں کے ساتھ کچھ بھی تعلق ہو یا ان کے بدن وہاں جلے ہوں اس اختراعی قرار داد میں کچھ اثر نہیں۔ ہاں بندوں کا حاجت روا خالق اکبر ہے۔ جو اپنی رحمانیت سے اُن کی مرادیں پوری کرتا ہے اور نادان بُت پرست سمجھتے ہیں کہ یہ تمام فائدے بتوں نے پہنچائے ہیں۔ اللہ تعالٰی عالم الغیب ہے۔ اپنے بندوں کے حالات جانتا ہے۔ اس کو ان کی اس زندگی میں حاجت روائی منظور ہے۔ چاہے یہ اپنا مطلب کسی سے بھی مانگیں۔ مگر دیتا وہی ہے۔ جیسے شفیق باپ اپنے چھوٹے بچے کی حاجت کو جانتا ہے۔ اور جب وہ بچہ خدمت گار یا دایہ سے کچھ مانگتا ہے۔ تو وہ چیز باپ دے دیتا ہے۔ ایسا ہی بتوں کا حال ہے۔ بلکہ اہلِ اسلام کے قاعدے کے مطابق اہلِ قبور سے مانگنے والے کو خدا ہی دیتا ہے ــــ اور سائل نے یہ جو لکھا ہے کہ جب اہلِ قبور سے مدد چاہنی جائز ثابت ہوتی ہے تو ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا و مسانی کے پوجنے سے کیسے باز آجائیں گے۔ تو جواب یہ ہے کہ اہلِ قبور سے مدد چاہنے اور سیتلا و مسانی کے پوجنے

میں کئی وجہ سے فرق ہے۔ اول یہ کہ اہل قبور صالحین اور بزرگ لوگ ہیں جن کے حالات خوب معلوم ہیں۔ اور سیتلا و مسانی وہی ہیں۔ جن کی نسبت یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیسے تھے بلکہ ظاہر امعلوم ہے کہ یہ سب ان کی خیال بندی ہے۔ دوسری یہ بات ہے کہ اگر سیتلا و مسانی کا فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ کبھی تھے تو وہ خبیث ارواح اور شیطانی وجود ہونگے جنہوں نے خلق کی ایذا رسانی پر کمر باندھ رکھی ہے (جیسا کہ ہندوؤں کے اعتقاد سے ظاہر ہے) ان کو انبیا و اولیا کی پاک روحوں سے کیا مناسبت۔ تیسری بات یہ ہے کہ اہل قبور سے مدد مانگنا بطریق دعا کے ہے کہ جناب الٰہی میں عرض کر کے ہماری حاجت روائی کر دیا کیجئے اور بتوں وغیرہ کی پرستش اس اعتقاد کی بنا پر ہے کہ وہ قادر مستقل ہیں اور یہ اعتقاد کفر خالص ہے۔[1]

اس فتوے سے ظاہر ہو گیا کہ نذروں اور نیازوں کا ثواب بزرگان دین کی ارواح کو پہنچانا اور بارگاہ حق میں انہیں شفیع جاننا بالکل حق اور موافق شرع ہے مسلمان اہل قبور اور اولیاء کی پرستش نہیں کرتے۔ جیسے کہ بتوں کی ہندو کیا کرتے ہیں مسلمان تو صرف شفاعت چاہا کرتے ہیں۔ مگر شاہ اسمٰعیل نے اپنے عقیدہ کی بنا پر شاہ عبدالعزیز کے جواب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے عقیدہ پر نہ صرف قائم رہے۔ بلکہ اپنے اختراعات پر اصرار بھی کیا اُن کی جدتیں تحریف پر مبنی ہیں۔ اور تحریف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اصل مضمون یا علم پر پورا عبور ہو ورنہ تحریف جہل ٹھیرے گی۔ بتایا گیا ہے کہ تحریف کیوں کی جاتی ہے۔ اسکے اسباب یہ ہیں۔ تہاون و تساہل تعمق۔ تشدد فی الدین اور استحسان۔[2] استحسان کو فقہا نے قیاس خفی سے موسوم کیا ہے لیکن اس کے معنی تشریح بالرائے کے ہیں۔ ابلیس نے حکم الٰہی کی نافرمانی کر کے اپنی رائے سے کام لیا تھا۔ لہذا سب سے پہلے اسی نے قول بالرائے کو وضع کیا۔ تقلید سے انکار کرنے کے بعد قرآن کو بالرائے سمجھنا فرعونیت کے دروازے کھولنے کے برابر ہے

---

[1] فتاوی عزیزیہ ص [2] تفصیل شرح حجۃ البالغہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تحریف، تنگ نظر اور متعصب بنا دیا کرتی ہے۔ چنانچہ شرک کی مخالفت کرنے کے سلسلہ میں ان کو نفی کرنے کی اس قدر عادت پڑ گئی کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "شدِ رحال" اور امکانِ نظیر جیسی لاطائل و بے سود بحثیں ایجاد کر لیں یعنی رسول اللہ صلعم کے روضہ کی زیارت کے لئے سواری کا انتظام کرنا جائز نہیں۔ اور یہ کہ خاتم النبیین جیسا رسول پیدا کرنے کی اللہ کو قدرت ہے۔ امکانِ نظیر کی بحث کا فیصلہ مرزا غالب مرحوم نے بڑے لطیف انداز میں کیا ہے اور اس جماعت کی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ یہ ہے ؎

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است / قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے / ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود / رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر / یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو خاتم را مجوی / صد ہزاراں عالم و خاتم بگوی
غالب این اندیشہ نپذیرم ہمے / خُردہ ہم بر خویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ / دانم از روئے یقینش خواندۂ
این الف لامے کہ استغراق راست / حکمِ ناطق معنئ اطلاق راست
منشاءِ ایجاد ہر عالم یکے است / گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمالِ ذاتی است / لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم والسلام
نامہ را در می نوردم والسلام

شاہ اسماعیل کی دماغی قلابازیاں ذاتِ نبوت ہی تک رہیں۔ اور شکر ہے کہ کمزوری اور کم ہمتی کی وجہ سے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے، ورنہ یہ کہہ سکتے تھے

کہ خدا میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنی نفی کرسکے، چونکہ وہ اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجبور ہے اور خدا مجبور نہیں ہوا کرتا، یہ واقعی ان کا کرم ہے کہ خُدا کو نفی سے معاف کر دیا۔

۱۔ شاہ اسمٰعیل کی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تقلید ناجائز ہے۔ مگر انہوں نے اپنے اس حکم کی سند نہیں پیش کی ہے۔ خدا جانے یہ کسی پیش رو کی نقالی ہے یا شاہ صاحب کی اپنی ذاتی رائے اور اختراع ہے ــــ لیکن اسلام میں مطلقاً تقلید اور تقلیدِ مجتہدین کے ثبوت موجود ہیں۔ تقلید کا واجب و ضروری ہونا آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، عملِ امت اور اقوالِ مفسرین و محدثین سے روز روشن کی طرح واضح و ثابت ہے۔ اس کا خلاف کرنے والا جاہلِ محض ہے۔ اس موضوع پر علماء کرام نے جامع و مانع کتب لکھی ہیں۔ جن کا جواب مقلدینِ شاہ اسمٰعیل کے پاس نہیں ہے۔

۲۔ طریقت میں بیعت جو لی جاتی ہے۔ اس میں عہد لیا جاتا ہے کہ مرید مرشد کی تقلید کریگا۔ اور انحراف کرنے سے مردودِ بیعت ہو جائیگا۔ شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے بیعت ضرور کی۔ مگر عہد کو نباہا نہیں۔ اسلئے کہ وہ تقلید کے منکر بنے۔

۳۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر علم و فن کی بقا و ترقی تقلید ہی پر منحصر ہے۔ بغیر اپنے بنیادی اصل کے اور بغیر اُستاد کی رہنمائی کے کوئی علم و فن پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ہر علم و فن کے اصول اَسلاف سے ہی منتقل و منقول ہوتے ہیں۔ اور قول بالرائے سے کبھی فائدہ نہیں پہنچتا۔

۴۔ تقلیدِ شخصی کا خواہ کس قدر بھی انکار کیا جائے مگر تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ غیر مقلد کہلانے والا اگر ائمہ مجتہدین کی تقلید نہیں کریگا تو اُن کی تقلید کرے گا۔ جنہوں نے اُسے تقلید کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ یہی چلا آتا ہے کہ یہ لوگ ائمہ اربعہ کا انکار کرکے نہ صرف اُن سے کم تر درجہ کے لوگوں کے مقلد ہو جاتے ہیں۔ بلکہ گمراہوں کی تقلید۔

کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مثال جناب ابوالکلام آزاد کے حالات سے ملتی ہے۔ وہ زیرِ عنوان "سرسید کی تقلید کا دور" لکھتے ہیں:-

"اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی۔ میرا اشارہ سرسید کے مصنفات کی طرف ہے چونکہ اس واقعہ نے میرے عقائد وافکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے ... والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے۔ کہ پہلے وہابیت پھر نیچریت نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو الحادِ قطعی کی ہے۔ اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے اسلئے کہ وہ نیچریت کو ہی الحادِ قطعی سمجھتے تھے۔ لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ عقائد و فکر کے توسیع و تطور کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اب اگر اس کے بعد آزادیٔ فکر نے قیاسی و مطلق العنانی کی صورت اختیار کرے تو بلاشبہ یہ نہایت مضر صورتیں بھی اختیار کر سکتی ہے۔"[۱]

پھر لکھتے ہیں۔ "میں بُت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا۔ ... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترکِ تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے۔ ان ہی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ میں نے سرسید سے سب سے بڑی چیز جو اس وقت پائی تھی، وہ یہی ترکِ تقلید تھی مفسرین کی، فقہائی، محدثین کی، تمام علمائ کی تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلمات کی، اور ان کروڑوں اور انگنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گذرے ہیں۔ تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلد ہی تھا۔ بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا۔"[۲]

پھر اس کا نتیجہ برآمد تھا۔ وہ بھی جناب ابوالکلام کی زبانی سنئے۔

۱۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی صفحہ ۳۶۔

۲۔ " " " " صفحہ ۳۰

"چند دنوں کے بعد شک و اضطراب نے انکار تک رسائی پیدا کر لی .... چند دنوں کی فکر و کشمکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کر لیا اور صبح سے نماز ترک کر دی ۔" (ص ۳۲) انا للہ و انا الیہ راجعون۔

غیر مقلدوں کی تقلید اور اس کے بُرے نتائج خود ایسے شخص نے بیان فرمائے ہیں جو آخر تک غیر مقلد ہی رہے۔ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر اسماعیلیوں کو سوچنا چاہیئے کہ وہ شاہ اسماعیل کے مقلدِ اعمٰی ہیں یا نہیں ۔۔۔ بہر حال ہمیں تو یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور فرمایا گیا ہے کہ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا [۱]۔

۵۔ شرک و توحید کی حقیقت حضرت امام فخر الدین رازیؒ کے ایک واقعہ سے بھی واضح ہو سکتی ہے ۔ امام صاحب علم و فضل میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ مختلف بیش بہا تصانیف کے مالک ہیں جن میں سے تفسیر قرآن اور دیگر کتب بہت مشہور ہیں۔ اور پھر بادشاہ کے محکمۂ قضا کے افسر اعلیٰ بھی وہی تھے۔ شیطان کو رد کرنے کی تین سو پینسٹھ (۳۶۵) تدبیریں انہوں نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ کی فقیری پر ان کی مقبولیت دیکھ کر امام صاحب کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ اور انہیں حضرت نجم الدین کبریٰؒ سے کوئی شغف نہ تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ شاہزادہ بیمار ہوا اور قریب مرگ ہو گیا۔ تو بادشاہ سے کہا گیا کہ حضرت نجم الدین کبریٰؒ سے دعا کے لئے رجوع کیا جائے۔ بادشاہ نے شاہ نجم الدین کو بلا بھیجا اور اپنے برابر تخت پر انہیں جگہ دی جو امام صاحب کو شاق گذری۔ علاج اور دعا کی استدعا کی گئی تو شاہ صاحب نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ یہ حدیث کہ مومن کا جھوٹا شفا ہے صحیح ہے یا ضعیف ہے۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ صحیح ہے ۔
مگر پسینہ آ گیا اور طوطے ہرن ہو گئے۔ برجستہ حضرت

۱؎ مسئلہ تقلید و اجتہاد کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے "عقد الجید" میں جو کچھ لکھا ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔

نجم الدین نے گذارش کی کہ امام صاحب آپ سے بڑھ کر مومن کون ہو سکتا ہے۔ پانی منگائیے
اور بسم اللہ کہہ کر شہزادے کو اپنا جھوٹا پانی پلا دیجئے۔ انشاء اللہ شفا ہوگی۔ جسے ردِ تنبیہ
سمجھ کر امام صاحب کی بُری حالت ہو گئی۔ اور حضرت نجم الدین نے اصرار کیا کہ آپ
اپنا جھوٹا پانی پلا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اللہ کے فضل سے شاہزادے کو شفا ہو گئی
اس کے بعد امام صاحب کی کشمکش اور خلش اتنی بڑھی کہ اس کو دُور کرنے کیلئے حضرت
نجم الدین کبریٰ کے مرید ہو گئے۔ بیعت کے بعد بھی فضیلت علم کی وجہ سے چون و چرا
کی عادت باقی رہی۔ آخر کار جب آخری وقت آیا اور امام صاحب پر عالم نزع طاری
ہوا تو شیطان نے حملہ کیا اور امام صاحب کی لکھی ہوئی دلیلوں اور تدبیروں کا اس نے کاٹ
کر دیا۔ ایک دلیل باقی رہی تھی کہ نجم الدین کبریٰ کھڑے ہوئے تشریف لائے اور بے تابی
سے تکرار کرنا شروع کر دی "کہہ دے کہ اللہ کو بلا دلیل پہچانا" اس طرح امام صاحب
کا ایمان بچا اور بفضلہٖ خاتمہ بالخیر ہوا۔ دلیلوں پر اعتبار کرنا ایمان کی نشانی نہیں یہی
منطقی دلیلیں اعتبار و ناز کی وجہ سے شرک نہیں بلکہ شرک اکبر بن جاتی ہیں۔ اسی لئے
حضرت نجم الدینؒ نے انہیں سبق پڑھایا کہ منطق سے توبہ کر دو تاکہ ایمان کامل ہو۔ اور
خاتمہ بہ خیر ہو۔ اسلام کا لفظ خود اپنے معنی بیان کر رہا ہے۔ تسلیم کامل ہی کا نام توحید
ہے۔ جملہ انبیاء و اولیاء کی زندگی بتا رہی ہے کہ اپنی رائے اور مرضی کو خدا کی رائے اور
مرضی پر قربان کر دینا توحید ہے۔ اور یہ توحید بغیر تقلید کے کبھی حاصل نہیں ہوا کرتی۔ اب
اگر کفار و مشرکین اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں۔ تو ان کی باتیں اساطیر الاولین ہیں
اور ان کے اصول جن پر مشرکین کا اجماع ہے۔ انسانی خامیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ مگر
ایک مسلمان جب اپنے سلف کا اتباع کرتا ہے تو اس کے سلف کا اصول قرآن و رسول
کے وسیلہ سے خدا تک پہنچتا ہے۔ اب کوئی صاحب عقل سلفِ صالحین کی تقلید کو مشرکین
والی تقلید سے نہ تشبیہ دے سکتا ہے۔ اور نہ برابر سمجھ سکتا ہے۔ انکارِ تقلید کا بدرجہ

یہ بتایا گیا ہے۔ کہ قرآن ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے کسی زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تشریح بالرائے کو انہوں نے تقلید پر ترجیح و فضیلت دی ہے مگر خدا جانے وہ راسخون فی العلم اور "اولوا العلم" کے معنی کیا لیتے ہیں۔ جو محکمات و متشابہات کو سمجھا کر قرآن تک رسائی کراتے ہیں۔ اور شک و شبہ و زیغ کو دور کیا کرتے ہیں۔ اگر قرآن کے معنی ہر شخص سمجھ سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہدایت نہ فرماتے کہ قرآن سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ اب بھی اگر تقلید سے انکار ہے تو بتایا جائے کہ جماعت اسمٰعیلیہ کا وجود کس وجہ سے ہے۔ اور شاہ اسمٰعیل نے اپنی تقلید کرنے کو کیوں مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ معصوم نہ تھے۔ ان پر امامت کا بھی شبہ نہ کسی نے کیا اور نہ انہوں نے خود اعلان کیا۔

شاہ اسمٰعیل کی تعلیمات کے متعلق سیر حاصل مباحثے اور مناظرے ہو چکے ہیں مگر افہام و تفہیم کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ہمارے علماء اپنے عقائد کو پیش کر کے ان کے عقائد کی تردید کرتے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد بھی قرآن و حدیث پر مبنی ہیں۔ لہذا اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا۔ ضرورت ہے کہ پہلے اُن کا نظریہ سمجھا جائے پھر اس کے مطابق ان سے گفتگو کی جائے۔ اور سمجھایا جائے کہ انہوں نے قرآن و حدیث کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ پھر اپنے عقائد کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو مضامین ان کے صحیح نکلیں۔ ان کو تسلیم کر لیا جائے ورنہ سلسلہ نامتناہی کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو

(۱) وہ غیر خدا سے مدد مانگنے کو برا سمجھتے ہیں۔ اور ہم بھی برا سمجھتے ہیں (جبکہ کسی کو مستقل بالذات مددگار سمجھا جائے) لہذا سب سے پہلے طے کیا جائے کہ غیر خدا سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ غیر خدا میں۔ آپ اور میں سب ہی آجاتے ہیں۔ لہذا وہ ہر آفرینش اور اظہار قدرت خداوندی کو غیر سمجھتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی مقرب نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کا خدا لفظ کُن سے ہر شئے اور اسباب مہیا کر سکتا ہے

مگر کسی کو اپنا بنانے کی اس میں قدرت نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عادت نہیں ہے کہ کسی کو اپنی معرفت عطا کرے یا مقرب بنا کر کمالات و اختیارات سے نوازے یا کسی کو ذریعہ اور وسیلہ بنائے۔ لہذا فرشتے، انبیاء وغیرہ اس کے دوست نہیں ہیں بلکہ معاذ اللہ مثل بُت اور بھوتوں کے ہیں۔ وہ قرآن کو القا کر سکتا تھا یا الواح کی صورت میں عطا کر سکتا تھا۔ اب جو اس نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول پر قرآن اتارا اور رسول نے قرآن ہمیں سمجھایا۔ یہ سب نعوذ باللہ تسلیم کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ جبریل علیہ السلام اور رسول نہ اس کی معرفت رکھتے ہیں۔ نہ اللہ کے دوست ہیں۔ اور نہ خادم ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوتے تو بھوت پریت سے تشبیہہ نہ دی جاتی۔ برخلاف ان کے ہم خاصان خدا کے معترف ہیں۔ ان کی فیض رسانی کے قائل ہیں اور ان کو بارگاہ الہٰی میں اپنا وسیلہ اور شفیع گردانتے ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس طرح انہوں نے توحید کا میدان تنگ اور محدود کر دیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے ہوتے ان میں توحید غائب نہ ہو جائے اور ہم اللہ کی غیر محدود قدرت کی وسعت کو چار دانگ عالم سے بھی فزوں اور لا محدود سمجھتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے کارکن مقرر فرمائے ہیں اور مختلف کام مختلف ملائکہ اور بندوں کے سپرد کئے ہیں اور ہم اللہ کی اور اس کے انتظام کی تبلیغ و اشاعت اس قدر کرنا چاہتے ہیں کہ وہی وہ ہو جائے اور اس کے غیر کا نام نہ رہے۔ غیر کو فنا کرنے میں ان کی اور ہماری کوشش یکساں مان لی جائے تو فرق مقدم و مؤخر کا رہ جاتا ہے۔ ہم توحید کے ذریعہ شرک کو مٹاتے ہیں اور وہ شرک کی معرفت توحید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسلام سے خارج کرتے ہیں اور ہم داخل و شامل کرتے ہیں۔

(۲) وہ کہتے ہیں کہ طعام و فاتحہ کا ثواب مُردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ انکے نزدیک مُردے مثل مٹی کے بے حس اور بے روح ہیں۔ اور ہم اس کے برعکس عقیدہ رکھتے

ہیں۔ ثواب کا پہنچنا۔ عالم ارواح کی بات ہے۔ جس کا علم انہیں نہیں ہے اور ہمیں احادیث صحیحہ اقوالِ فقہا اور تعامل اولیا۔ اللہ کے ذریعے ۔ لہٰذا یہ نزاع محض انکی ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ البتہ اتنی بات ان کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس حیلے سے محتاجوں اور مساکین کو طعام پہنچ جاتا ہے اور یہ کارِ خیر ہے۔ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسلئے اس مادّی وظاہری ثواب کو تسلیم کرلیا جائے۔ تو یہ بحث ختم ہو سکتی ہے ا۔

(۳) آمین بالجہر اور رفع یدین اور قبر پر روشنی کرنے کا اختلاف ایسا نہیں کہ دل ٹھے کرلئے جائیں۔ اس پر بحث عبث ہے۔ ان امور میں ان کے اختیار کو تسلیم کرلیا جائے وہ ہمارے اختیار کو تسلیم کرلیں۔ اس میں کسی کا بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ اور بس۔ لہٰذا قصہ ختم۔ رہا قبروں کو سجدہ کرنا۔ تو اسے ہم بھی حرام سمجھتے ہیں۔

(۴) تصوف کے وہ منکر ہیں اور تصورِ شیخ کو شرک سمجھتے ہیں۔ بہت اچھا وہ اسے بدعت ہی سمجھیں۔ مگر ہم اس کے قائل ہیں۔ اور تصوف و تصور کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے بعد طریقت کا نمبر آتا ہے۔ جو طریقت کے درجہ میں نہیں پہنچا ہے۔ وہ اگر تصوف و تصور کو نہیں مانتا تو بجا ہے۔ یہ اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے اب یا تو نہیں اپنی ناواقفیت تسلیم کرلینا چاہیئے یا طریقت کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کو حق نہیں ہے کہ شریعت کی اصطلاحوں سے طریقت کو جانچیں شریعت خود طریقت کا راستہ بتاتی ہے۔ نماز فرض ہے۔ مگر بغیر حضورِ قلب کے نماز نماز نہیں ہوتی۔ یہ شریعت کا مسئلہ ہے اور حضورِ قلب بغیر طریقت کے حاصل

لہ آب ذمیہ صاحب کی مصنوعی قبر پر روشنی کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ زائرین کی سہولتوں کا بندوبست کیا جارہا ہے اور نقلی قبر کی زیارت کے لئے شدرحال کیا جاتا ہے اور بقول شیخ اکرام صاحب شاہ اسماعیل کی قبر پر نسوار چڑھا کر منتیں مانی جاتی ہیں۔ پھر اختلاف کیا رہا؟ ہاں یہ قسمت کی بات ہے کہ خاوی خان کے مرشد حضرت اخوند صاحب کے مزار پر پاک و طاہر چیزیں لے جائی جاتی ہیں اور خادی خان کو قتل کرانے والوں کے لئے تمباکو کی نسوار رہ گئی ہے۔ وہابیہ جس کے حرام ہونے کے قائل ہیں (ناشر)

نہیں ہوتا۔ حضورِ قلب حاصل کرنے کا ایک طریقہ تصوف ہے۔ ورنہ مادی و ظاہری نہیں۔ اسلئے شریعت اس پر حکم نہیں لگا سکتی۔ وہ بغیر طریقت کے اگر یہ حضورِ قلب حاصل کرسکتے ہوں تو براہِ کرم اسکی تدبیر بتا دیں۔ مختصر یہ کہ یہ چیز بھی جہت ہی بے خبری ہے۔

(۵) ذکر کے وہ مخالف ہیں۔ مگر قرآنِ پاک اٹھتے بیٹھتے وضو بے وضو یادِ الٰہی اور ذکر کی تائید کرتا ہے اور کثرتِ ذکر کی ترغیب دیتا ہے۔ لہذا ان کی مخالفت تعجب خیز ہے۔ اور اگر وہ ذکر کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں تو قرآن ان کی سمجھ پر ہے۔

(۶) وہ قرآن کو بالرائے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور مفسرین کا اتباع نہیں کرنا چاہتے۔ ان میں سے ہر شخص کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ مغالطہ اجماع کے ذریعہ دور ہو سکتا۔ اگر وہ اجماع کو غلط سمجھتے ہیں تو یہ مسئلہ الہام سے طے ہو سکتا ہے۔ الہام کی تدبیر نہیں معلوم ہوگی مگر ہم الہام کو اپنے اختیار سے باہر سمجھتے ہیں۔

(۷) وہ حدیث کے مخالف ہیں۔ اس کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں اور دشمنانہ کا دلائل پیش کرتے ہیں۔ تنقید و دانشوری پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ وسیلہ کی تصدیق کرتا ہے اور اسی سے اس کی اہمیت واضح و ثابت ہو جاتی ہے۔

(۸) وہ انبیاء و اولیاء عظام کو بشریت کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی بشریت کی وجہ سے وہ ایسا خیال رکھتے ہیں کہ عہدہ اور فرائض نبوت ادا کرنے کی وجہ سے انہیں یقیناً شرف حاصل ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ اور پھر یہ تو عقل و تہذیب کی بات ہے کہ نیک کی تشبیہ نیک ہی سے ہونا چاہیے۔

(۹) ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنے بعض صفات سے مزین کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ خدا یا انصاف۔ یہ تو کھلی ہوئی کم نظری اور کوتاہ اندیشی ہے۔

(۱۰) وہ کہتے ہیں کہ مر جانے کے بعد ہر امتیاز مٹ جاتا ہے اور خاصانِ خدا بھی

مثل عام مُردوں کے ہیں۔ نہ سُن سکتے ہیں۔ نہ جواب دے سکتے ہیں۔ ہم انبیاؑ واولیاؒ کی حیات بعد الموت اُن حالات وواقعات سے بھی پیش کر سکتے ہیں جو انہوں نے خود سید صاحب کے متعلق ارقام فرمائے ہیں۔ غرض ہم برزخی حیات کے قائل ہیں۔ اور اس کا علانیہ اظہار کرتے ہیں۔ منکرین ومخالفین روحانیت کے ذریعہ ہی حقیقت کو خود بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اسلئے یہ قیل وقال فضول ہے۔

(۱۱) وہ ایک خاطی وعاصی مسلمان کو مشرک خیال کر کے واجب القتل قرار دیتے ہیں ہم ایک موحد کو جو خلوص کے ساتھ اقرار رسالت نہ کرے دائرہ اسلام میں شامل نہیں کرتے۔ اور منافق کو خارج از اسلام خیال کرتے ہیں۔ ایک کافر جب توبہ کر کے پاک وصاف بن جانے کا حق رکھتا ہے تو ایک خاطی مسلمان تو بدرجہ اولےٰ پاکی وصفائی کا مستحق ہے۔ ایک گنہگار کلمہ گو کی مثال مرغابی کی سی ہے جس کے پروبال آب نجالت سے نکل کر خشک اور ستھرے ہو جاتے ہیں۔ خاطی کلمہ گو کو شرک کا لکچر دینے کے بجائے شفقت سے۔ اصلاح حال کیلئے کوشش کرنی چاہئے۔

(۱۲) ہر کسی کلمہ گو مسلمان پر وہ تمام آیات قرآنی جو مشرکین کے متعلق ہیں۔ چشم زدن میں منطبق کر دیتے ہیں اور ہم آیاتِ رحمت سُنا کر عقیدہ وعمل کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(۱۳) چونکہ وہ خاصان خدا کو مُردہ سمجھتے ہیں۔ اور مُردہ کو ندا کرنا صحیح نہیں۔ اسی لئے ندا کرنے کو شرک بتاتے ہیں۔ ہمارے علما قرآن وحدیث سے استنباط کر کے غیر خدا کو ندا کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ مگر انہیں قائل کرنے کے لئے یہ ثبوت مفید نہیں ہو سکتا ہمیں ان کے جواب میں صرف یہ ثابت کرنا چاہئیے کہ خاصان خدا مثل عام مُردوں کے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ ان صاحبان نے یا تو سورہ آل عمران کی آیات نمبر ۲۱ ، ۲۲ ، پر غور نہیں کیا۔ یا خُدا جانے کوئی اور مطلب نکال لیا ہے۔ بہر حال ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے

پھر تیر نشانہ پر بیٹھے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ قابل قبول ہو اور بہت ثبوت قرآن و حدیث میں علانیہ موجود ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ کی آیت میں صاف حکم ہے کہ رسول کے متعلق ذو معنی الفاظ نہیں کہنا چاہیے۔ بلکہ ان کی عظمت کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ رسولوں کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ وہ رکیک تشبیہوں سے کام لیتے ہیں [illegible] ان کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ [illegible] ہوسکتی ہے قرآن کی بعض باتیں تسلیم کرنا اور بعض باتوں سے انکار کر دینا [illegible] نہیں ہوسکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کی نسبت ان کی فصاحت و بلاغت [illegible] کے خلاف کو ان کی طاقت نے کہاں اور کیسے مرتب دیا ہے۔ کاش وہ سمجھتے کہ اسلام محبت و آشتی کا مذہب ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ بے ادب بے نصیب ہوتا ہے۔ شاید وہ [illegible] کی وجہ سے اس بدنصیبی کو اپنی خوش نصیبی خیال کرتے ہیں۔ مبارک ہو۔

(۵) اُن کی سوئے ادبی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں رسول کا تصور اور خیال آجانا گاؤ خر کے خیال و تصور سے زیادہ بدتر ہے۔ یہ عقیدہ کسی توحید پرست کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دلی جہالت کی علامت ہے۔ انہوں نے اس کی دلیل و وجہ بتائی ہے وہ دروغ حقیقت سے لبریز اور بیماری ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ رسول کا تصور و خیال دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور گدھے اور بیل کا تصور جلد دفع ہو جاتا

[illegible] میں ایک مرتبہ ایسا [illegible] جلسہ ہو رہا تھا۔ مزدوروں [illegible] کے ایک ممبر نے جو مزدوروں کا [illegible] ناشائستہ [illegible] میں ناشائستہ الفاظ ہیں۔ میں نے اسے تنبیہ کی۔ تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ ان الفاظ سے گستاخی مقصود و منظور نہیں بلکہ یہ ہمارا تکیہ کلام ہے۔ [illegible] ہی فرشتے [illegible]

ہے۔ اس طرح وہ نعمت کا اقرار کر کے خود کو نعمت سے محروم کر لیں۔ تو یہ نکی جہالت و بدنصیبی کی بیّن علامت ہے۔ مگر ہم رسول کے تصور کو نعمت و رحمت سمجھ کر سینہ سے لگائے رہتے ہیں۔ اللہم زد فزد۔

(۱۶) توحید و رسالت کی تصدیق ہی ایمان کی جڑ ہے۔ یہ ہمیں اور انہیں دونوں کو تسلیم ہے۔ مگر وہ ایمان میں عمل کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ہم اس اضافہ کو نہیں مانتے ہمارے نزدیک محض تصدیق اور اقرار توحید و رسالت پر ہی ایمان مبنی ہے۔ ہم عمل کو اس اقرار و تصدیق کا نتیجہ سمجھتے ہیں عمل کی خرابی و کوتاہی کی وجہ سے تصدیق زائل نہیں ہوتی۔ ہماری خطاؤں کی دربار الٰہی میں نبی شفاعت کریں گے۔ ہمارے لئے در توبہ کھلا ہوا ہے اور اللہ تعالےٰ نے ازراہ فضل و کرم مومنوں کی خطائیں معاف کر دینے کی خود بھی امید دلائی ہے اس کا وعدہ حق ہے۔

ہم اور وہ دونوں موحد ہیں۔ ہم دونوں کو توحید پرستی کا دعویٰ ہے ہم دونوں وہم و خیال میں بھی اللہ تعالےٰ کا ہمسر و شریک کسی کو نہیں مانتے۔ نہ انبیاء کو۔ نہ اولیاء کو اور نہ ائمہ و علماء کو۔ الوہیت صرف وحدہٗ لاشریک کی تنہا خصوصیت ہے۔ مگر ہمارا خدا ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ اور اُن کا خدا جھوٹ بھی بول سکتا ہے ظلم بھی کر سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور وہ سمجھتے ہیں کہ "ان افعال کی وجہ سے ذات باری میں کوئی قبیح لازم نہیں آسکتا"[۱] اب کوئی بتائے کہ عقیدۂ توحید کس کا خالص ہے۔ ہمارا یا اُن کا؟

وہ توحید کے قائل ہیں۔ نظام توحید کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن نظام توحید کے متعینہ منتظمین، مبلغین اور کارکنان قضا و قدر کی قدر نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا سا قیاس کر کے ان کو محض ڈاکیہ اور گماشتہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاصان خدا کی تعظیم و محبت

---

(۱) ملاحظہ ہو "جہد المقل" صفحہ ۔۔ مصنفہ مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی۔

ان کے نزدیک بدعت و شرک ہے اور چونکہ ہم ان باتوں کو رسول کی نسبت ثابت کرتے ہیں لہذا ہم پر شرک کا الزام کیا جاتا ہے۔

وہ رسالت میں بھی بندی کی چیزیں نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ رسول کو علم غیب نہیں رسول کو کوئی اختیار نہیں اور رسول کو حاجت [illegible] نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رسول خدا کا بندہ ہے۔ مگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے رسولوں کو عام بندوں سے اپنی بعض خصوصیات عطا کر کے ممتاز فرمایا ہے اور خود سید المرسلین صلعم کی خصوصیات و امتیازات تو تمام رسولوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ یہ لوگ بے قیاس اور حسن ظن سے رسولوں کے متعلق جو باتیں روا رکھتے ہیں ہم [illegible] کہ رسول اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے [illegible] کا [illegible] نہیں [illegible] متعدد بزرگوں نے [illegible] اپنی علیہ الصلوۃ والسلام [illegible] یکساں [illegible] نہیں۔ اگر یہ ان حضرات کے قول ہیں تو رسالت کے متعلق ان کی تمام جہالتیں [illegible] ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ان حضرات سے انہیں انکار ہے تو ان کا فیصلہ [illegible] ہی کر سکتے ہیں۔

جب حضور نبوی کی حدیث نورانیت اس درجہ مشہور ہے کہ یہ نہیں [illegible] تو فقہ متقدمین میں بھی [illegible] ان کی بات کی شہادت دے سکتی ہے۔ [illegible] نورانی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلام ان کی ذات [illegible] اور کر لینے کی وجہ سے اپنی [illegible] زندگی میں [illegible] نہیں [illegible] نورانیت تھی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر [illegible] آگے پیچھے [illegible] ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ علم [illegible] غلط کرے

---

(۱) فاضل مصنف کا اس طرف خیال [illegible] کہ حضور کے [illegible] ظاہر کرنے کا [illegible] حاصل کیا ہے مگر علمائے اہلسنت نے [illegible] ۱۲ مرتبہ رد کیا ہے [illegible]

والے تو قادر مطلق جل شانہٗ نے رحمۃ للعالمین صلعم کو علم غیب سے سرفراز فرمایا ہو اور اختیارات مرحمت نہ کئے ہوں۔ ہم سے پوچھئے تو ان معجزات کو ہم آنکھیں بند کر کے صدق دل سے مانتے ہیں۔ ہر نوعیت سے مانتے ہیں، معناً بھی، حرفاً بھی اور بغیر چون و چرا کے اپنے اپنے رجحان کے مطابق معجزات کی موافق یا مخالف تاویل کوئی کر بھی لے تو یہ اپنی اپنی خوشی کی بات ہے لیکن معجزات تک عقل کی رسائی کہاں ہے۔ معجزات عقل شکن اور بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں۔ جسمانی و روحانی بحث تو بعد کی پیداوار ہے، مگر جب صاحب معراج صلی اللہ علیہ وسلّم نے معراج کا حال سنایا تو کفار نے مذاق اڑایا، اور حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر کہا کہ تمہارے نبیؐ معراج کا حال کہہ رہے ہیں ہم کیا سمجھیں۔ انہوں نے متانت و سنجیدگی سے جواب دیا، اگر وہ فرماتے ہیں، تو صحیح ہے۔ ان کے فرمانے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس جواب سے کفار شرمندہ ہو کر رہ گئے اور حضرت ابو بکرؓ لقب صدیق سے سرفراز ہو کر صاحب ایمان لوگوں کے سردار ہو گئے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اسمٰعیلی جماعت کے بنیادی اصولوں سے جو خود منجملہ فروعات ہیں۔ عجیب و غریب متضاد فروعات نمودار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے عقیدے اور عمل میں یکسانیت نہیں ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جوش عقیدت میں اپنے عمل و عقیدہ کی برہمی کا ان لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں ہے اور اگر ہے تو اقرار نہیں کرتے۔ وہ اپنے فروعات کو اپنے اصل اصول سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فتنہ و فساد پھیلاؤ، تو جواب دیتے ہیں۔ کہ ہم ایمان و امن کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جن کے ایمان میں تیقن نہ ہو۔ جن کا عقیدۂ توحید مشکوک ہو۔ جو رسول کریم صلوٰۃ اللہ علیہ کی مسلسل اہانت کرنے کے عادی ہوں اور کلمہ گویوں کو مشرک قرار دیتے ہوں ایسے لوگوں سے بحث کرنا اور تصفیہ کی امید رکھنا نہ صرف غلط ہے بلکہ تضیع اوقات

ست بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔ لہٰذا ہمارے لئے تین ہی صورتیں ہیں کہ:۔

(۱) حضور نبوی میں التجا کریں۔

کچھ ایسی بنی ہے کہ بنائے نہیں بنتی
بگڑی کو بنا دیجئے سلطانِ مدینہ

(۲) اللہ کے سپرد کر دیں وہی بہترین تصفیہ کرنے والا ہے۔

(۳) یا ارشاد قرآن کے مطابق ان لوگوں کو سلام کریں فقط والسلام۔

حلیہ

جناب سید احمد صاحب رائے بریلوی کی شخصیت ہند و پاک کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے معتقدین و مخالفین نے ان کے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کی تصویر شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شبیہہ اگر سامنے ہوتی تو علم قیافہ کے ذریعے اس شخصیت کے قول و فعل کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی۔ ان کی تصویر شاید اس لئے شائع نہیں کی گئی کہ شرعاً ممنوع ہے۔ یا اس لئے منظر عام پر نہیں آسکی کہ محفوظ نہیں رہ سکی۔ ان کی تصویر بنائے جانے کے ثبوت موجود ہیں۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ کے حوالہ سے مہر صاحب لکھتے ہیں۔ "شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک مسگر کا مصور کو مقرر کیا تاکہ ان کی تصویر ہو بہو کھینچے۔ جب اس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا۔ رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیئے۔ اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب (سید صاحب) کی تصویر سے جوانمردی کی بُو سونگھ کر کہا "آفرین" اور منصفانہ تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا۔ تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔" (سید احمد شہید جلد ۲ صفحہ ۲۳۲)

ظفر نامہ کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد مہر صاحب فرماتے ہیں۔

"اگر یہ بیان درست ہے تو کچھ معلوم نہیں۔ وہ تصویر کیا ہوئی اور کہاں گئی؟ ممکن ہے پرانے ریکارڈوں میں اس کا کچھ سراغ مل جائے۔ مہر صاحب کی اس تحریر سے عیاں ہے کہ

---

(۱) یعنی دیوان امرناتھ مصنف ظفر نامہ نے۔

انہیں بھی سید صاحب کی تصویر کے محفوظ نہ رہنے کا صدمہ ہے۔ مگر "تحفۂ محمدیہ"
یہ بھی بتاتی ہے کہ سید صاحب کی شبیہ اسماعیلیوں کے پاس بھی تھی۔ لکھا ہے کہ:-

"چندہ جمع کرنے کی خاطر ۱۲۶۲ھ میں فرخ آباد میں حضرت سید احمد صاحب کی تصویر لائے تھے۔" (تحفۂ محمدیہ مطبوعہ ۱۲۶۵ھ صفحہ ۲۰) بہرحال یہ تصویر بھی محال ہے۔

اندریں حالات چند سوانح نگاروں نے سید صاحب کا حلیہ لکھ کر احسانِ عظیم کیا ہے۔ مگر وہ اس قدر ناکافی ہے کہ صحیح نقشہ نہیں جمایا جا سکتا۔ اور آنکھوں کے سامنے پوری تصویر نہیں آتی۔ بہرحال وہ ناکافی ہی سہی مگر خاکہ ہے۔

بقول جعفر تھانیسری:-

"رنگ سرخ، ریش سفید، بروت سیاہ، قوی ہیکل، خندہ رو، دراز بینی، پیوستہ ابرو، کشادہ پیشانی اور بلند قامت۔"

بروایت مرزا حیرت دہلوی:-

"رنگ سفید و سرخ، سینہ چوڑا، ہاتھ پاؤں سڈول، کلائیاں چوڑی، آنکھیں نکیلی اور چھوٹی، گندمے ذرا اٹھے ہوئے۔ قد نہ لمبا نہ چھوٹا۔ بلکہ اوسط۔"

مہر صاحب نے حلیہ تو بیان نہیں کیا۔ مگر اُن کو شہ زور ثابت کرنے میں زور مارا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ان میں جن یا دیو کے برابر طاقت تھی۔ (سید احمد شہید جلد اول صفحہ ۶۰)

بروایت ہنٹر:-

"قد درمیانہ، سینہ تک لمبی ڈاڑھی، کم گو، خوش اخلاق، وجدانی کیفیت میں اکثر مبتلا و سرشار۔"

یہ واقعی حیرت ہے کہ سید صاحب کے حالات، عقائد اور اعمال کی طرح اُن کی شکل و شباہت میں بھی اختلاف ہے۔ اور کوئی بھی ان کا صحیح طور پر اندازہ و خاطر نہ کر سکا۔ تصویر وغیرہ برطرف مگر ہنٹر نے ایک ناقابل فہم بات لکھی ہے جس کو دیکھ

دیکھ کر ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہیں اور عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اس کے صحیح ہونے کا امکان ہو۔ مگر کیا کیا جائے کہ اسکے بیان کی تائید "تحفہ محمدیہ" والے اور مولانا ابوالکلام نے بھی کی ہے۔ بہر حال ہنٹر نے لکھا ہے کہ :۔ "جناب سید صاحب کی شہادت کے بعد سلسلہ کو بڑھانے کے لئے سید صاحب کا بُت تیار کیا گیا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے :۔

" ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کی کرامت کے متعلق تحقیقات کرنا کرامت سے خالی نہیں تھا ..... ایک جانثار مبلغ ..... ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا ... اس نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ کوہستانی علاقہ میں اس غار تک ضرور پہنچے گا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے امام کو چھپا رکھا ہے جب وہ اس خانقاہ کے دروازے کے اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس سے بھرے ہوئے موجود ہیں۔ یہ مبلغ وہاں سے بھاگا۔ اور مریدوں کو خط لکھا۔

" ملا قادر نے امام صاحب کا بُت بنایا ہے۔ مگر کسی کو دکھانے سے پہلے یہ وعدہ کر لیتا ہے کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا اور نہ ان سے بولنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے امام صاحب چودہ برس کے لئے گُم ہو جائیں گے ..... جب بہت عرصہ تک تسلی بخش جواب نہ ملا تو لوگوں میں امام صاحب سے ہاتھ ملانے کی خواہش ہوئی مگر ملا قادر نے یقین دلایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو امام صاحب کے خادم (جو اُنکے پاس کھڑے ہیں) پستول مار دیں گے۔ (آخر کار اندر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا ہے۔ اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سے انسانی شکل دیدی ہے ..... دریافت کرنے پر ملا قادر صاحب نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے۔ امام صاحب نے خود بطور معجزہ اپنے آپ کو ایک گھاس کے بھرے ہوئے مجسمے کی شکل میں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا ہے۔" (ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر

صادق حسین صـ)

معتقدین سید صاحب کے نزدیک منظر معتبر شخص ہے۔ اسلئے اس کے مندرجہ بالا بیان کو صحیح ہی سمجھا جائیگا۔ اس پر بھی دو ثقہ حضرات کی شہادتیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ مولوی سید اشرف علی گلشن آبادی جناب سید صاحب کے ارادت مند تھے۔ انہوں نے اپنی تالیف "تحفہ محمدیہ" میں لکھا ہے۔ "سید احمد کا پتلا بنایا"؟ (تحفہ محمدیہ صـ۲۳ سطر ۵):-

"ایک بکری کے چمڑے کی پتلے کی شکل بنا، لوگوں کو فریب دینے لگے" (صـ۲۴ سطر۱)

پتلا بنائے جانے اور دیگر کئی واقعات پر بڑی عالمانہ بحث کرنے کے بعد مولانا زید نے یوں اقرار کیا ہے:-

"یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی اغراض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا اور کچھ دنوں تک یہ بات مشہور رہی تھی کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے اور سید زندہ و سلامت موجود ہیں۔ لیکن یہ ان ہی چالاک آدمیوں کی کارروائی تھی اور بہت جلد کھل گئی۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو وہابیت یا مولوی اسماعیل مرحوم کی جماعت سے کیا تعلق؟"

(ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی صـ۳۵)

اب مولانا آزاد صاحب کے بیان کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کسی کی صفائی پیش کریں۔ بت بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ جو کہ بت گر سید صاحب کے مرید اور شاہ اسمٰعیل سے تربیت یافتہ تھے کیا محمدی خان کی داد یا حضرت اخوند صاحب کے مریدین کو کیا ضرورت تھی۔ لیکن بت بنانا بہرحال یہ حرکت کسی کی بھی ہو اس دعوت و تبلیغ کا نتیجہ نہایت مسعود نا تھا اور یہی کہا جا سکتا ہے ؎

از مدرسہ بہ دیر روم یا بہ بتکدہ ــــ اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست؟

کتابیات

۱۔ سوانح احمدی۔ — مولوی محمد جعفر تھانیسری۔

۲۔ حیاتِ طیبہ۔ — مرزا حیرت دہلوی۔

۳۔ سیرت سید احمد شہید۔ — مولانا ابوالحسن ندوی۔

۴۔ سید احمد شہید۔ — مولانا غلام رسول مہر۔

۵۔ برکاتِ اسلام۔ — مولوی محمد جعفر تھانیسری۔

۶۔ سیف الجبار۔ — مولانا فضل رسول بدایونی۔

۷۔ باغی ہندوستان۔ — مولانا عبدالشاہد خاں شروانی۔

۸۔ صراطِ مستقیم — سید احمد شہید رائے بریلوی۔

۹۔ تقویۃ الایمان — شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی۔

۱۰۔ تحفہ محمدیہ — سید اشرف علی گلشن آبادی۔

۱۱۔ الاستمداد علی اجیال الارتداد۔ — مولانا احمد رضا خاں و مولانا مصطفٰی رضا بریلوی۔

۱۲۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ

۱۳۔ موج کوثر۔ — شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس۔

۱۴۔ سوانح قاسمی۔ — مولانا مناظر احسن گیلانی۔

۱۵۔ روضات۔ — شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

۱۶۔ تذکرۃ الرشید — مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔

۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک۔ — مولانا عبیداللہ سندھی۔

۱۸۔ الیاقوتۃ الواسطہ — مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ

۱۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ — ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔

۲۰۔ تذکرہ علماء و مشائخ سرحد۔ — مولانا محمد امیر شاہ قادری پشاوری۔

۲۱۔ امداد المشتاق — مولانا اشرف علی تھانوی۔

۲۲۔ ابوالکلام کی کہانی خود انکی زبانی۔ — عبدالرزاق ملیح آبادی۔

۲۳۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ — حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

۲۴۔ حالات کتب وہابیہ۔

۲۵۔ الکوکبۃ الشہابیہ — مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔

۲۶۔ مقالات سرسید حصہ شانزدہم۔

۲۷۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا (انگریزی) از تاراچند۔

28- MILL'S HISTORY OF INDIA VOL V

29- MILL & NELSON HISTORY OF INDIA 5TH EDITION VOL III

30- A. B. KIETH- A CONSTITUTIONAL HISTORY OF INDIA 2nd Edition, 1937

31- HISTORY OF ENGLAND IN THE 18th CENTURY VOL IV

32- NOTES ON INDIAN AFFAIRS VOL II

33- RECORDS OF INDIAN FACTS VOL I

34. T. G. SPEAR THE NOBLES

35- THOMSON EDWORD The MAKING OF INDIAN PRINCES

36- CAMBRIDGE SHORT HISTORY OF INDIA

37- REGENOL REYNOLD:- THE WHITE SAHIBS OF INDIA

38- R. C. DUT- COMMITTEE OF CIRCUITS MINUTES SEPT. 15-1775

39- WOODRUF, PHILIP- THE MAN WHO RULED IN INDIA THE FOUNDERS

40- LACKY- A HISTORY OF ENGLAND IN THE 18th CENTURY VOL. IV.

اعلان

مکتبہ مسعود لاہور اسی موضوع پر دو اور لاجواب کتابیں پیش کرنے کا فخر حاصل کرے گا۔ ایک کتاب ہمارے فاضل بزرگ مولانا عنایت اللہ چشتی مدظلہ کی سالہا سال کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے دوسری جناب مولوی محمد شفیع رضوی کی تحقیقِ دقیق کا ثمرہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ محمد جعفر تھانیسری پر جو تحریف کا الزام عائد کیا جاتا ہے، وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے منتظر رہیئے

ناظم مکتبہ مسعود، ۲۹۹ مسجد گراؤنڈ رام گڑھ کالونی

لاھور

صدر الافاضل حضرت مولانا محمد نعیم الدین۔ مراد آبادی
قدس سرہٗ
کی لاجواب کتاب

اطیب البیان

جو ردِّ "تقویت الایمان" میں مدلّل کتاب ہے۔

پھر چھپ گئی ہے

قیمت تین روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

مکتبہ مسعود۔ مسجد گراونڈ۔ رام گڑھ لاہور

امام العارفین سند السالکین سیدنا و مولانا حضرت مخدوم سید علی ہجویری

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

کی مشہور و معروف معرکۃ الآرا تصنیف

کشف المحجوب

غیر مجلد 7/-

ہدیہ مجلد 8/50

کا نہایت عام فہم با محاورہ اردو ترجمہ

اگرچہ اس کتاب کے بہت سے اردو تراجم پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن بعض ترجمے اصل عبارت فارسی کے مطابق نہیں، اور کئی عبارتیں بھی حذف ہو گئی ہیں۔ یہ ترجمہ کسی قسم کی قطع و برید کے بغیر حضرت داتا صاحب کی اصل فارسی کتاب کے عین مطابق کیا گیا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے، جس کے متعلق آپ نے فرمایا میرا مقصود اس کتاب سے یہ ہے کہ جس کے پاس یہ کتاب ہو اسے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہے

نوری بک ڈپو بالمقابل دربار داتا صاحب۔ لاہور